اکادمی
ادبیات
پاکستان
پاکستانی
ادب کے
معمار
احمد شمیم : شخصیت اور فن
منیرہ شمیم

پاکستانی ادب کے معمار

احمد شمیم
شخصیت اور فن

منیرہ شمیم

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	افتخار عارف
مہتمم	عتیق الرحمٰن
تدوین و طباعت	سعیدہ درانی
سکیچ	احمد حبیب
اشاعت	2008
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد -/220 روپے پیپر بیک -/210 روپے

ISBN: 978-969-472-147-7

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

جدید اردو نظم کا منظر نامہ احمد شمیم کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ کشمیری شاعری میں مجبور اور آزاد کی روایت کے تسلسل میں احمد شمیم بہت نمایاں تخلیق کار کے طور پر شناخت کیے جاتے ہیں۔ نظریاتی سطح پر انسانیت، انصاف اور مساوات کے لیے احمد شمیم کی تڑپ اور حساسیت ان کی تخلیق کو غیر معمولی رفعتوں سے ہم کنار کرتی ہے۔ صحافت، صدا کاری، ڈرامہ نگاری، افسانہ نگاری، نغمہ نگاری اور مضمون نگاری سمیت کتنی ہی جہتیں ہیں، جن سے ان کا تخلیقی زندگی نامہ ترتیب پاتا ہے۔ انہوں نے شریکِ حیات کو جو خطوط لکھے وہ کتابی صورت میں شائع ہو کر مکتوب نگاری کی تاریخ میں بہت اہم مقام و مرتبے کے حامل ٹھہرے ہیں۔ ان خطوط کے بغیر احمد شمیم کے بطونِ ذات اور تخلیقی اظہار کی تفہیم کسی طور مکمل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ترقی پسند فکر اور جدیدیت کے امتزاج سے جدید اردو نظم کو بے حد ثروت مند بنایا، یہی وجہ ہے کہ تنقید نگار احمد شمیم کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔

منیرہ شمیم صاحبہ نے اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ''احمد شمیم: شخصیت اور فن'' لکھ کر نہ صرف یہ کہ اردو ادب کی بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے بلکہ احمد شمیم کی رفاقت کا قرض بھی بہت احسن طریقے سے ادا کیا ہے۔ ادارہ ان کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے یہ درخواست خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے ہماری عزت افزائی کی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ "پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

مجھے بے انتہا خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ آج سے چند ماہ پیشتر مجھ سے احمد شمیم کی شخصیت پر مقالہ لکھنے کا جو تقاضا کیا گیا تھا اس سے میں کس حد تک عہدہ برآ ہو سکی ہوں، اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی۔ اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

چونکہ احمد شمیم کی یادوں کا سرمایہ کچھ میرے ذہن میں اور کچھ ان کے چاہنے والوں کی تحریروں کی صورت میں میرے پاس جمع تھا۔ اس لیے یہ مجموعہ مرتب کرنے میں مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ میں نے اس سارے مواد کو قطع و برید، ترمیم اور اضافے کے ساتھ یک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات اس کی شخصیت اور نقطۂ نظر کا آئینہ ہوتی ہیں اور اس کا فن ذاتی اور عمومی زندگی کو گرفت میں لانے کا وسیلہ۔

احمد شمیم کو ہم سے بچھڑے ہوئے کچھ وقت ہو گیا ہے لیکن مجھے ان کے شخصیت اور فن کے بارے میں جہاں روشنی کی کرن نظر آئی میں نے اُسے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اسی طرح کی روشنی سے ہی ہم کسی فنکار کا پورٹریٹ بنا سکتے ہیں۔ کسی فنکار کی شخصیت اور فن کی گہرائیوں میں اُترنے کے لیے اس کے فن پاروں میں سے ہی بکھری ہوئی شخصیت کو اخذ کر کے یکجا کیا جا سکتا ہے۔

احمد شمیم اپنی سوچ، خیالات اور تحریروں میں جس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں اس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ وہ خوددار، حساس، بے باک، ہمدرد اور محبت کرنے والے شخص تھے۔ ان کی شخصیت واقعی ایسی ہی تھی۔ عام زندگی میں وہ اپنے حُسنِ اخلاق سے تمام چھوٹے بڑوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ذہانت، حسِ مزاح اور کھری بات کہنے کی جرات ان کی شخصیت کے خاص اوصاف تھے۔ وہ ایک محبِ وطن کشمیری، سری نگر کے ایک خوبصورت گوشۂ عافیت چنار کے مکین تھے۔ وہاں کی خوش رنگ فضاؤں میں پل کر جوان ہونے والا ___ ہجرت تک چناروں کے سایوں میں رہا اور چناروں کی آگ اپنے اندر سموتا رہا۔ کشمیر کی محبت اور اس سے دوری کا احساس ان کی شاعری میں ٹھنڈک، مٹی کی خوشبو، ہواؤں کی لچک، چاند ستاروں کی روشنی اور گلِ لالہ کی مہک کی طرح رچا بسا ہوا ہے۔ کشمیر سے دوری اور اپنی دھرتی سے محبت احمد شمیم کی شاعری کے جذباتی اور فکری مسائل کا مرکز و محور نظر آتے ہیں۔ اپنوں کی جدائی اور گھر بار کو

تیاگ کر آنے والے احمد شمیم کو پاکستان آ کر احساس ہوا کہ جو قربانیاں ارضِ پاکستان کے حصول کی خاطر دیں، وہ ثمر ور نہ ہوئیں، ابھی منزل بہت آگے تھی۔

شمیم معاشی اور معاشرتی ناہمواری اور رنگ و نسل کے امتیاز اور انسان کے انسان پر غلبے اور تسلط کے خلاف ایک ایسے جہاں کی تلاش میں تھے جہاں عدل و مساوات اور امن ہو۔ کشمیر کے برف زاروں اور جیل کی سلاخوں سے بھاگا ہوا احمد شمیم زندگی بھر انسان کی آزادی اور مساوات کے خواب دیکھتا رہا۔ اپنوں سے دوری، پاکستان میں ناموزوں حالات، خوابوں کے ٹوٹنے اور ان کی کرچیوں کا روح میں اترنے کا عمل بہت جان لیوا تھا ایسے میں احمد شمیم کی شاعری نے انہیں بڑا سہارا دیا جو ان کے دکھ، درد کے اظہار کا ذریعہ بنی اور ان کی اذیتوں کا مرہم بنتی رہی۔

وہ تو کشمیر کی خوبصورت وادی میں چھائی دھند سے رنگوں، روشنیوں اور خوبصورتیوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ فطری شاعر تھا اور روشنی کی تتلیوں کے استعاروں کے حوالے سے نئے دن کی نوید سناتا رہا۔ یہ ایک غم ہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی ماں سے دور تھا اور دھرتی ماں سے بھی دوری کے احساس نے اس ہجر زدہ شاعر سے "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو" جیسی نظم لکھوائی۔ یہ سچ ہے کہ احمد شمیم کو جذباتی طور پر ___ اس کیفیت سے تادمِ آخر رہائی حاصل نہ ہو سکی اور یہ نظم ان کی شاعری میں عظمت کی دلیل اور ان کی پہچان کی ضامن بن گئی لیکن اس نظم سے ہٹ کر اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں ایک وسعت اور گہرائی کا تاثر ملتا ہے۔ غم بڑا ہو تو اس کے اظہار کے لیے وسیع کینوس بھی چاہیے۔ اسی وسیع کینوس پر احمد شمیم نے اپنی برتی ہوئی زندگی اور عصری منظرنامے کی تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے تجربے اور مشاہدے کی آنکھ سے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھا کہ زندگی کے بہت سے اسرار اُن پر عیاں ہوتے گئے اور کربناکیوں کو سہنے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا۔ لیکن ان کی تحریروں میں ایک بات مشترک اور نمایاں ہے وہ ان کا احساسِ تنہائی اور فلسفۂ مرگ ہے۔ ہر فرد کی تنہائی اور موت جو اٹل حقیقت ہے ان کی شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔

وہ خوددار، درویش صفت انسان تھے۔ دنیا اور آسائشوں کی پروا نہ تھی۔ ان کی شخصیت میں انسانی اقدار کا اُجلا پن رچا ہوا تھا۔ وہ دنیاوی مال و دولت کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ خودغرضی اور منافقت سے نفرت تھی۔ ساری زندگی حق کی خاطر لڑتے ہوئے گزار دی، کبھی باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ وہ اس دنیا کو انسانی محبت اور صلح و آشتی کے جذبوں سے سجا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

ان کی طبیعت میں بے باکی، صاف گوئی اور بے تکلفی تھی۔ محبت کا اظہار شدت سے کرتے تھے۔ شاعری کے علاوہ وہ ڈرامے، افسانے، تنقید، متفرق مضامین اور اداریے بھی لکھتے رہے۔ وہ بے ساختہ اور اعلیٰ پائے کی نثر لکھنے میں بھی طاق تھے اور اس کا نمونہ ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ وہ ایک حساس، محبت

کرنے والے کھرے انسان تھے۔ جو ڈرامے انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے لکھے، ان میں اپنے کمال فن کے جوہر دکھائے۔ ان کا ڈرامہ "سیپ، سمندر اور ساحل" نے ۱۹۷۵ء میں جشن تمثیل ڈرامہ فیسٹول میں ایوارڈ حاصل کیا۔

احمد شمیم کا شمار ان چند ادبی شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے بیک وقت دو یا دو سے زیادہ زبانوں میں شاعری کی اور مقبولیت حاصل کی۔ اردو اور کشمیری زبان کے تناظر میں اگر دیکھیں تو کشمیری شاعر غلام احمد مہجور کے بعد احمد شمیم ہی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے بیک وقت دونوں زبانوں میں یکساں اعلیٰ درجے کی شاعری کی اور مقام پایا۔

احمد شمیم کا ذکر اور ان کا فن ہمارے درمیان اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کے درمیان ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے انسانیت کے لیے لکھا، محبت کے لیے لکھا، آزادی کے لیے لکھا اور یہ وہ جذبے ہیں جو کبھی نہیں مرتے۔ اپنی منفرد تحریروں کے ساتھ احمد شمیم ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے میں اکادمی ادبیات کے چیئرمین جناب افتخار عارف صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے احمد شمیم کے بارے میں اس کتاب کو اکادمی کے تحت شائع کر کے ان کے ادبی قد و قامت اور مقام و مرتبہ کا اعتراف کیا۔

محترمہ سعیدہ درانی کی شکر گزار ہوں جو ہر مرحلے پر نہایت شفقت اور فراخدلی سے پیش آئیں اور مجھ سے تعاون کیا۔ آفتاب اقبال شمیم کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جنہوں نے مقالے کی تیاری میں مدد کی اور احمد شمیم کے لیے اپنی دوستی کا حق ادا کیا۔

منیرہ شمیم

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں، رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو!

احمد شمیم

احمد شمیم ۔حالات زندگی

احمد شمیم ایک ہمہ جہت موصوف قسم کی شخصیت تھے۔ وہ ادب کے فری لانسر تھے۔ انہوں نے غزلیں کہیں، نظمیں لکھیں، ٹی وی اور ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے، اخبارات میں کالم لکھے، یہاں تک کہ افسانے بھی لکھے۔

اسلامی تاریخ اور تہذیب، ہندوستانی تاریخ و تہذیب، دیو مالا، یونانی تاریخ و تہذیب، مغربی تہذیب کا انہوں نے گہرا مطالعہ کرر کھا تھا۔ تاریخ انسانی کے جبر کے بارے میں مطالعہ بے پناہ تھا۔ انسانی تاریخ کی ادبی اور سیاسی شخصیات میں حضرت محمد ﷺ، حضرت امام حسینؓ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، کارل مارکس، لینن، ہیگل، کرکے کامیو، سارتر، کافکا گار، ماؤزے تنگ، گوریا اور ہو چی منہ انکی پسندیدہ شخصیات تھیں۔ آٹھویں جماعت سے شعر کہنا شروع کیے۔

تاریخ پیدائش

احمد شمیم کا بچپن اور لڑکپن لاعلمی اور دوری کی دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ آج کل قومی شناختی کارڈ بن چکے ہیں۔ ہر پاکستانی اپنی تاریخ پیدائش کی سند اپنی جیب میں لیے پھرتا ہے۔ اکثر شاعروں اور ادیبوں کی طرح ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ایک جگہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۳۰ء بھی لکھی ہوئی ہے لیکن ان کی اپنی تحریر کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش بمقام سری نگر یکم جون ۱۹۲۷ء ہے۔

والدین

ان کے والد کا نام خواجہ اسداللہ زرگر تھا۔ شمیم اپنے والدین کی دوسری اولاد تھے۔ والدین نے ان کا نام غلام محمد زرگر رکھا۔ ان کے ترقی پسندانہ خیالات و نظریات کا اظہار شاعری کے علاوہ دیگر

اعمال و افعال میں بھی ہونے لگا۔ اسی دوران انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے احمد شمیم رکھ لیا۔ اس کے بعد ساری زندگی اسی نام سے لکھتے رہے۔ یوں غلام محمد زرگر سے تو بہت کم لوگ واقف تھے جبکہ احمد شمیم کو ایک زمانہ جان گیا۔

ان کے والد اور والدہ بہت دیندار اور متقی تھے۔ سارے گھرانے میں اسلامی اقدار اور روایات کا خاص خیال رکھا جاتا۔ ان کے خاندان کی میر واعظ کشمیر جناب یوسف شاہ سے دلی عقیدت تھی۔ میرے ایک خط میں احمد شمیم نے اپنے والدین کے بارے میں لکھا ہے:

"شام تمہاری طرح چپ چاپ اور اُداس ہوتی ہے اور تُو میری ماں کی طرح گم سم اور خاموش ہے۔ شام کو اکثر مجھے تم اور پھر اپنی ماں یاد آتی ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے بھی ماں کے روپ میں دیکھا کہ میں تمہارا بے انتہا احترام کرتا ہوں اور ایک اس لیے بھی ماں کے روپ میں دیکھا کہ وہ بھی گم سم اور چپ چاپ اور دکھ اُٹھانے والی تھی۔ نفسیاتی اعتبار سے وہ تم سے بہت ملتی تھی۔ میری زندگی میں غم شروع سے داخل ہوا ہے۔ منو، ایک بار کشمیر میں زبردست بھونچال آیا جو کئی دن تک آتا رہا۔ یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ میرے بڑے بھائی پیدا ہوئے تھے اور اس طرح میری والدہ کا ابھی ایک ہی بچہ تھا۔ بھونچال کا پہلا جھٹکا رات کو ہوا سینکڑوں مکان گر گئے۔ ہماری والدہ کا میکہ ہمارے قریب ہی تھا۔ ان کا مکان بھی رات کو گر گیا اور سارا کنبہ زندہ دفن ہو گیا صرف ایک ماموں بچ گئے جس کی عمر اس وقت مشکل سے تین سال تھی۔ اس واقعے نے میری والدہ کے دل کو ہمیشہ کے لیے بجھا کر رکھ دیا۔ ان کے لیے دنیا ایک غم خانہ بن گئی، اُن کی آنکھوں میں بسی ہوئی اُداسی سے پتہ چلتا تھا کہ غم ان کی ذات کا سنگِ بنیاد بن گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہمارے ابا سے کبھی کسی چیز کا تقاضا نہیں کیا۔ وہ کبھی کسی رشتہ دار کے ہاں نہیں گئیں اور اولاد کے ساتھ ان کی محبت میں ایک خاموش دیوانہ پن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مجھے یاد ہے جب میں دیر سے آیا کرتا تھا تو وہ باہر صحن میں میرا انتظار کرتی رہتی تھیں اور شدید برفباری میں بھی وہ اس طرح میری منتظر ہوتی تھیں۔ اُنہوں نے کبھی مجھ سے دیر سے آنے کا شکوہ نہیں کیا لیکن وہ مجروح اور زخمی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ پھر جب میں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو پولیس روز گھر

آ جاتی تھی اسے عجیب خطرہ رہتا تھا اس نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ میں اپنی جان کیوں
خطرے میں ڈالتا ہوں جب میں دیر سے آتا تھا تو ان دنوں انہیں میں کمرے میں
بکل مارے نماز پڑھتے دیکھتا تھا۔ وہ پہروں سجدے میں گری رہتی تھیں اور روتی
رہتی تھیں۔ جب میں آتا تو وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں جن میں شکوہ نہیں
خوف ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے کبھی کچھ نہیں کہا، کبھی کبھی وہ دبے پاؤں میرے
کمرے میں آتیں اور مجھے کسی کتاب پر جھکا دیکھ کر میرے پاس بیٹھ جاتیں
اور میرے کندھے اور سر دبانا شروع کر دیتیں۔

مجھے یاد ہے جب مجھے پہلی دفعہ پکڑ کر لے گئے تو وہ کھڑکی سے مجھے دیکھ رہی تھیں
۔میرے آگے پیچھے پولیس کے سپاہی تھے۔ میں نے مڑ کے دیکھا اس کے سر سے
دوپٹہ گر گیا تھا اور وہ گھائل پرندے کی طرح دیکھ رہی تھی۔ ایک عرصے بعد مجھے جیل
سے چھوڑ دیا گیا، میں گھر اطلاع نہیں دے سکا اور چپکے سے گھر چلا آیا۔ راستے میں
بہت سارے دوست میرے ساتھ چلے آئے گھر کے قریب ایک بزرگ نے مجھے
دیکھا۔ وہ بھاگے اور والدہ کو آواز دی۔ زینب تیرا بیٹا آ گیا ہے۔

اور پھر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنی ماں کو چیختے سنا تھا لیکن
اس کے بعد مجھے مسلسل اپنی ذات سے الجھنا پڑا، پولیس اور حکومت سے الجھنا پڑا۔
میری ماں خاموشی سے یہ سارا دکھ سہتی رہی اس دکھ کی وجہ سے میں اس کا پیارا بیٹا بن
گیا اور ایک بڑا زخم بھی ______ لیکن اس نے کبھی شکایت نہ کی بس وہ
میرے دکھ میں جلتی رہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے سیاسی معاملات اور میری
اخباری زندگی کو کبھی بھی نہ سمجھ سکی کیونکہ وہ نہایت سادی عورت تھی۔ اس کے لیے
زندگی خدا، خاوند اور اولاد تک محدود تھی اور وہ اسی تکون کو کائنات سمجھتی تھی۔ خدا جانے
اس کے دل میں میرے لیے کیا کیا حسرتیں تھیں جو پوری نہ ہوئیں اور میں اس
شاخ سے کٹ کر آوارہ پتا بن گیا۔

خدا جانے میں تمہارے اندر محبوبہ اور بیوی سے زیادہ ماں کیوں ڈھونڈتا رہتا ہوں۔
کیا یہ اس وجہ سے ہے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی ماں کا پرتو دیکھ لیا ہے یا اس لیے
کہ میری ماں کی طرح تو بھی میرے دکھ میں جلتی ہے۔ کیا اس لیے کہ تو بھی راتوں

کو اُٹھ اُٹھ کر میری سلامتی کے لیے دعا مانگتی رہتی ہے۔
آہ منو _ میری ماں _ میں تجھے کیسے بتاؤں تو میرے لیے کیا ہے!(۱)
پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''منو! میں اس دور میں پلا بڑھا ہوں جب سیاسی کشمکش اپنے عروج پر تھی اور ایک انتہائی ذہین اور حساس طالب علم ہونے کی حیثیت سے حالات نے مجھے فوری طور پر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ۱۹۴۷ء کا بیت ناک دور میرے شعور کا ابتدائی دور تھا۔ تو اس دور میں پیدا ہوئی اور جب تمہارے شعور نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف جمود اور خاموشی تھی۔ آج کل ٹیڈی ازم __ کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی میں وہ حرارت اور گرمی نہیں رہی اور اجتماعی مرکز نہیں رہا۔ کالج کی زندگی، نئی تحریکوں کے سرچشمے نہیں، ایک نصابی مشین ہے جو ہر سال بھاری تعداد میں ناپختہ ذہنوں کو مارکیٹ میں پھینک دیتی ہے۔ اُن کی زندگی کا شعور، ذات کا عرفان اور ماحول کا احساس نہیں ہوتا لیکن وہ دور اس سے مختلف تھا۔ ہر آدمی کا اپنا اصول تھا اور اپنے اقدار تھے اور ان اقدار کے لیے مرتا تھا، اجتماعی تحریکیں تھیں جس کی وجہ سے آپس کا اتفاق اور اتحاد۔ فرد اور فرد کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم تھا۔ اب یہ سب کچھ بکھر گیا۔ ہر شخص اپنے فائدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ذاتی منفعت، اصول پسندی بن گئی اور انسان خودغرضی کا میدان بن گیا ہے۔ اسی افراتفری کا نتیجہ وہ بے یقینی ہے جو گھروں میں والدین اور اولاد کے درمیان بھی پیدا ہو گئی ہے۔

اب کسی شخص کو اپنی ذات Discover کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ موقع نہیں دیا جاتا۔ مجھے اپنے والد صاحب یاد آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی میرے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ حالانکہ میری وجہ سے میرے گھر کو بڑی مصیبت اٹھانا پڑتی تھی لیکن وہ ہمیشہ ہی کہتے تھے کہ شمیم اپنا راستہ آپ تلاش کرے گا۔ اگر سیاست کے ذریعہ ہی وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے تو میں اسے نہیں روک سکتا میں صرف اس وقت اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاؤں گا جب وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے ہماری عزت پر حرف آئے۔ سچائی کے لیے لڑنا کوئی گناہ نہیں۔

ایک دفعہ وہ ملاقات کے لیے جیل چلے آئے۔ اندر سے مجھے سپاہی لے آئے۔ میری ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور دو آدمیوں نے مجھے سہارا دیا ہوا تھا۔ جب سلاخوں والے کمرے میں مجھے ان کے سامنے پہنچایا گیا تو میری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میں یہ آنسو پی لینے کے لیے اپنے ساتھ اُلجھ رہا تھا۔ والد صاحب آئے، آگے بڑھے، مجھے گلے سے لگایا اور کہا ہمت سے کام لینا چاہیے۔ بیٹا! جب آگ میں کود پڑے پھر ہمت ___ لیکن سارے آنسو میرے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ بڑی دیر تک تسلی دیتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہمیں جیل میں سخت جسمانی اور روحانی اذیت دی جا رہی ہے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے اگر انہوں نے کچھ کہا تو میں اپنے دکھ پر قابو نہ پاسکوں گا اور ٹوٹ جاؤں گا۔

وہ کچھ پھل ساتھ لائے تھے میں گم سم انہیں دیکھتا رہا۔ میری وجہ سے سارا گھر عذاب میں گرفتار تھا لیکن کبھی مجھ سے کسی نے شکوہ نہیں کیا۔ وہ میرے لیے خط لاتے تھے۔ والدہ پڑھی لکھی نہ تھیں خط پر ان کا انگوٹھا ہوتا تھا۔ والد صاحب انگوٹھے کے نشان کی طرف اشارہ کر کے کہتے "تمہاری ماں کا پیار ہے"۔ پھر وہ مسکراتے تھے صرف مجھے زندہ رکھنے کا بہانہ ہوتا تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ رونا چاہتے تھے لیکن میرا حوصلہ رکھنے کے لیے وہ نہیں روتے تھے۔ کہاں گئے وہ؟ اب میں تنہا ہوں۔ چوروں اور دشمنوں کا حلقہ ہے ایک تو ہے بس۔ کیا تو بھگوان کی طرح میرا رتھ بان بن جائے گی۔" (۲)

ابتدائی تعلیم

احمد شمیم کے گھرانے کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ دولت کی ریل پیل تو نہ تھی لیکن کسی قسم کی تنگی بھی نہ تھی۔ والدین پڑھے لکھے نہ تھے مگر اولاد کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے رہے۔ احمد شمیم نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول سری نگر سے حاصل کی۔ بقول ان کے بڑے بھائی کے جو سری نگر میں ہیں۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"شمیم نے ہمیشہ قابلیت کا وظیفہ حاصل کیا۔ بلکہ کبھی کسی مضمون میں دوسرے

درجے پر کامیاب نہیں ہوئے۔ ہمیشہ اول درجہ حاصل کیا۔ سکول اور کالج کے ہر ایک استاد ہمیشہ تعریف کرتے۔ یہاں ابھی تک شمیم صاحب کے اشعار موجود ہیں۔ کالج اور سکول میں شمیم نے ہمیشہ گھنٹوں تقاریر کیں اور قائداعظم کے سامنے بھی تقریر کی۔"(۳)

۱۹۴۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ سری پرتاب کالج سری نگر میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ شمیم کا شمار کالج کے ذہین اور فعال طلباء میں ہوتا تھا۔ احمد شمیم نے طالب علمی کے زمانے سے ہی تحریک پاکستان، آزادئ کشمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کے مطالبہ میں انہیں سری نگر جیل بھی جانا پڑا، جہاں انہیں قید تنہائی میں رکھا گیا لیکن انہوں نے جیل حکام کی نیندیں حرام کر دیں۔ جیل کے درودیوار پر نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد کے نعرے لکھتے تھے۔

کالج میں داخلے کے بعد ان کے ان نظریات کو مزید فروغ ملا۔ ادب سے تو بچپن سے ہی شغف رکھتے تھے۔ اب شاعری میں انقلاب اور ترقی پسندانہ نظریات میں دلچسپی لینے لگے۔ ان کے ترقی پسندانہ خیالات ونظریات کا اظہار ان کی شاعری کے علاوہ ان کے دیگر اعمال و افعال میں ہونے لگا۔ احمد شمیم نے ۱۹۵۶ میں بشمول انگریزی ادب فرسٹ ڈویژن میں ایف۔ اے کیا۔ ۱۹۵۸ میں فرسٹ ڈویژن میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ گارڈن کالج راولپنڈی میں ایم۔ اے، اُردو میں داخلہ لیا۔ لیکن ایم اے کی کلاسیں، کلاس روم کے غیر عالمانہ اور غیر دانشورانہ ماحول سے بددل ہو کر انہوں نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

احمد شمیم ہمیشہ سے کشمیر کے ناخواندہ اور پسماندہ عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کے داعی تھے۔ وہ اپنی عوام کو آوازِ حق بلند کرنے کی ترغیب دینا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کا کمیشن کشمیری عوام اور کشمیر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کشمیر آیا اور کشمیر کے سربراہ اور اراکین کو شیخ عبداللہ اور بخشی غلام محمد وغیرہ یہ تاثر دے رہے تھے کہ کشمیری عوام درحقیقت بھارت سے الحاق چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کمیشن سری پرتاب کالج سری نگر بھی آیا۔ کالج میں طلباء کے امتحان ہو رہے تھے۔ مسلمان طلباء نے اس وفد کی آمد اور شیخ عبداللہ کی بھارت نواز پالیسی کے خلاف امتحان کا بائیکاٹ کیا اور نعرے لگائے۔ اس مظاہرے میں احمد شمیم کے ساتھ سعید نقشبندی، عبدالوحید، اور بریگیڈیئر ڈاکٹر یوسف بھی شامل تھے۔ مظاہرے کے درمیان احمد شمیم نے ہندوؤں کی مکارانہ سازشوں اور بھارتی جارحیت کے خلاف دھواں دار تقریر بھی کی۔

شمیم اپنے ایک مضمون اثاثے میں لکھتے ہیں:

"جب کمیشن چلا گیا تو ڈوگرہ پولیس اور نیشنل کانفرنس کے غنڈوں نے کالج کو گھیرے میں لے لیا اور طلباء کو بُری طرح مارا پیٹا۔ کچھ مسلمان بھی اس عذاب کا شکار ہوئے۔ میرے کپڑے پھاڑ دیئے گئے اور میرا جسم لہولہان تھا۔ مجھے بھارتی فوج کی ایک جیپ میں ڈال دیا گیا اور تھانہ کھوٹی باغ پہنچا دیا گیا جہاں پہلے ہی کچھ طالب علم زخموں سے چور فوج کے نرغے میں تھے۔ جیپ سے گھسیٹ کر مجھے ایک بند کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ میں کمرے کے فرش پر بے جان جانور کی طرح گر گیا۔ پروفیسر ہاشمی میری طرف لپکے، میرا سر گود میں رکھ کر مجھے کہنے لگے:

"My son our Prophet has suffered more than this"

وہ خود زخموں سے چور تھے لیکن ان کی آواز میں ایسا ٹھہراؤ تھا کہ میرے زخم خود بخود بھرنے لگے۔ یہ فقرا میرا عظیم ترین اثاثہ ہے۔ آج بھی میں جب زندگی کی چوکھی جنگ سے لڑتے لڑتے تھک جاتا ہوں تو دبے پاؤں کہیں سے ہاشمی صاحب آ کر مجھ سے کہتے ہیں:

"My son our Prophet has suffered more than this"

تو میں پھر نئی قوت کے ساتھ اس جنگ میں شامل ہو جاتا ہوں۔" (۴)

پاکستان میں آمد اور ملازمت

تقریباً ایک ماہ بعد شمیم اور دیگر طلباء جیل سے رہا ہو گئے۔ مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد ان کی زندگی کا نصب العین بن چکی تھی۔ اپنی قائدانہ سرگرمیوں کی وجہ سے وہ پولیس کی نظروں میں آ چکے تھے۔ اس لیے پولیس بلاوجہ بھی انہیں تنگ کرنے لگی تھی۔ چنانچہ شمیم اور ان کے چند ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک کشمیر آزاد نہیں ہو جاتا اس وقت تک کشمیر چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں۔

یہاں شمیم کی پاکستان سے محبت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے اپنے والدین، بہن، بھائی اور جنم بھومی سے جدائی گوارہ کر لی اور پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ یوں جیل سے نکل کر سارے خاندان کو چھوڑ کر اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان کی راہ لی۔

پاکستان آنے کے فوراً بعد احمد شمیم ۱۹۴۸ء میں آزاد کشمیر ریڈیو مری میں بطور صداکار ملازم ہوئے۔ ریڈیو کی نشریات پورے جموں وکشمیر کے علاوہ کنٹرول لائن پار بھارت میں بھی نہایت ذوق اور جذبے سے سنی جاتی تھی۔ چونکہ احمد شمیم کنٹرول لائن کے پار بطور ایک طالب علم لیڈر کے کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے اس لیے کشمیری عوام اور احمد شمیم میں اجنبیت کی کوئی دیوار حائل نہ تھی اور آزاد فضا میں رہنے کی بدولت بہتر انداز میں تحریک آزادی کشمیر کے لیے کام کرنے لگے۔ ان کی ولولہ انگیز شاعری اور جذبات سے پُر مضامین نے کشمیر کے عوام کے دل میں سیاسی بیداری کی نئی لہر پیدا کر دی۔

۱۹۴۸ء میں ہی راولپنڈی آئے جہاں انہوں نے گورنمنٹ گارڈن کالج کی بیک سائیڈ پر واقع قیصر ہوٹل میں رہائش اختیار کی۔ اسی ہی دور میں جمیل ملک، آفتاب اقبال شمیم جیسے مخلص دوست ملے۔ آفتاب اقبال شمیم بتاتے ہیں کہ اس وقت وہ ایک جوشیلا اور خوبصورت نوجوان تھا اور اپنے نظریات کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

پاکستان آ کر کچھ وقت بہت تنگی سے گذارا کیونکہ یہاں ان کا کوئی رشتہ دار نہ تھا مگر روزگار کے سلسلے میں کبھی میرپور، کبھی مظفرآباد رہے۔ تاہم راولپنڈی سے ان کا سلسلہ منقطع نہ ہوا۔ راولپنڈی کی ادبی فضا اور پرانے دوستوں کی کشش انہیں بار بار واپس کھینچ لاتی۔ ۱۹۵۷ء میں وہ دوبارہ راولپنڈی آ گئے۔ اپنی ترقی پسندانہ جبلت کی بدولت پاکستان کے ترقی پسند مصنفین ان کے قریب آ گئے۔ اس دوران احمد شمیم ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے، جو کمپنی باغ (لیاقت باغ) میں منعقد ہوتے تھے۔ یوں انہوں نے اپنے خیالات ور جحانات کی بدولت ادبی حلقوں میں زبردست مقبولیت حاصل کر لی۔ راولپنڈی کا کافی ہاؤس شہر کا کلچرل سنٹر تھا، جہاں بیٹھنے والوں میں یوسف ظفر، مختار صدیقی، باقی صدیقی، عطا حسین کلیم، اظہار کاظمی، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، سلیم رفیقی، احمد ظفر، جمیل ملک، احمد شمیم، آفتاب اقبال شمیم اور طاؤس بانہالی شامل تھے۔

مقبولیت حاصل ہونے کے باوجود تنگدستی نے ساتھ نہ چھوڑا، اسی لیے شمیم کی رہائش نچلے درجے کے ہوٹلوں میں رہی۔ قیصر ہوٹل میں دو سال رہنے کے بعد ان کی رہائش جامع مسجد روڈ راولپنڈی میں ماں جی کے گھر میں رہی۔ وہ بچیوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں جنہیں اڑوس پڑوس میں سب ماں جی کے نام سے پکارتے تھے۔ احمد شمیم کے لیے ماں جی ایک بہت مہربان اور مشفق خاتون تھیں جن کے دامانِ شفقت میں احمد شمیم نے کم وبیش چھ سال گزارے۔ اس وقت شمیم مظفرآباد سے شائع ہونے والے ہفت روزہ کشمیر اور روزنامہ تعمیر راولپنڈی میں باقاعدہ لکھتے رہے۔ اُن دنوں ان کی ملاقات راولپنڈی میں ہی

خاندانی روحانی پیشوا میر واعظ کشمیر جناب یوسف شاہ سے ہوئی۔ جناب یوسف شاہ مرحوم نے اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے انہیں محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر ملازمت دلائی۔ بعد میں اسی محکمہ میں ترقی کرتے ہوئے ۱۹۷۵ء میں ناظم کے عہدے تک پہنچے۔

ازدواجی زندگی

احمد شمیم کے ساتھ میری ۱۹۶۴ء میں شادی ہوئی۔ ہم لوگ آپس میں رشتہ دار نہیں تھے چونکہ ان کے عزیز واقارب سری نگر میں تھے اس لیے انہیں یہ کام اپنی پسند ہی سے کرنا پڑا۔ شمیم انتہائی محبت کرنے والے اور انتہائی تعاون کرنے والے شوہر تھے۔ ان کا انداز واطوار جن کو دیکھ کر میں متاثر ہوئی تھی شادی کے بعد میں نے اس میں مزید بہتری پائی۔ وہ ازدواجی زندگی میں کسی قسم کی پابندی کے حق میں نہیں تھے اور باقاعدہ طور پر گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹاتے۔ شمیم سے میرا جھگڑا صرف سگریٹ نوشی پر ہوتا یا پھر بچوں کی فضول فرمائشیں پورا کرنے پر۔

وہ رات دیر تک اپنا مطالعۂ کا شوق پورا کرتے، لکھنے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ شمیم بہت مذہبی انسان تھے مگر انہوں نے مذہب کو اپنے اوپر طاری نہیں کیا۔

شادی سے پہلے وہ تین تین سو صفحات پر مشتمل خط لکھتے۔ یہ خطوط نہ صرف شمیم کی محبتوں کے امانت اور ان کے جذبوں کی شدتوں کے امین ہیں بلکہ اُردو ادب کے نثری ادب کا ایک لازوال حصہ ہیں۔

شمیم ایک کامیاب اور مثالی شوہر ہونے کے علاوہ ایک شفیق اور پیار کرنے والے باپ بھی تھے۔ ہمارے چار بچے ہیں۔ انہوں نے بطور باپ تمام تر ذمہ داریاں نہایت احسن انداز میں پوری کیں اور انہوں نے بچوں کو جس مقام پر دیکھنے کا خواب دیکھا اُسے پورا کرنے کے لیے بھر پور انداز میں کوشاں رہے اور اس خواب کی تعبیر اس انداز میں مکمل ہوئی کہ بیٹے عکس شمیم نے بیرون ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ آج ایک کامیاب ڈاکٹر کی زندگی گزار رہا ہے۔ بیٹی سمیرا، فائزہ اور بیلا اپنی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کر کے اپنے گھروں میں خوش آباد ہیں۔

ان کا حلقۂ احباب نہایت پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھا اور ان کے دوست آج بھی احمد شمیم سے دوستی نبھا رہے ہیں۔

احمد شمیم جب کبھی اپنے کسی دوست کو پریشان حال دیکھتے، ان کا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے لیکن اپنے دل کا حال انہوں نے کسی کو نہ سنایا۔ احمد شمیم کے انتہائی قریبی ساتھی جناب ڈاکٹر اعجاز راہی

فرماتے ہیں۔ مارشل لاء دور میں مجھے جبری طور پر ملازمت سے برخاست کیا گیا جس کا مجھے شدید صدمہ ہوا۔ میری حالت عجیب سی ہوگئی تھی۔ زبردست ذہنی انتشار کا شکار ہوا کہ اچانک ایک دن احمد شمیم سے ملاقات ہوگئی تو انہوں نے میری حالت دیکھ کر وجہ پوچھی تو میں نے وجہ بتائی اور کہا کہ اب تو میں زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں تو یہ سن کر احمد شمیم کو غصہ آ گیا مگر جلد ہی غصے پر قابو پایا اور مجھے پیار سے گالی دی اور کہا کہ تم تو پورے کے پورے انسان ہو۔ میری طرف دیکھو میں آدھا انسان وقت سے جنگ لڑ رہا ہوں اور تم ایک مکمل انسان ہونے کے باوجود ہمت ہار بیٹھے ہو۔ یہ الفاظ مجھے دوبارہ زندگی میں لے آئے اور میں تاحیات احمد شمیم کا احسان مند رہوں گا۔

احمد شمیم اپنی خوبیوں، اخلاق اور اچھے برتاؤ کی بدولت تمام چھوٹے بڑے لوگوں میں بہت مقبول تھے گو آج وہ، ان کا وجود ہم لوگوں میں نہیں لیکن ان کی باتیں، یادیں اور برجستگی ہمیشہ اس کی یاد دلاتی رہے گی۔

احمد شمیم بنیادی طور پر ایک حریت پسند کشمیری تھے اور پاکستان میں آنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ یہاں رہ کر موثر انداز میں کشمیر کی آزادی کے لیے کام کر سکیں گے مگر آزادی کشمیر کی تحریک موثر نمائندگی اور حریت پسندوں کے آپس کے اختلافات کے باعث کامیاب نہ ہو سکی، اس صورت حال میں کشمیر میں بھارت کا ظلم و ستم دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

احمد شمیم کی زندگی کا صرف ایک مقصد تھا یعنی کشمیر کی آزادی۔ یہی وجہ تھی کہ احمد شمیم پاکستان کو بین الاقوامی ماحول میں ترقی یافتہ ریاستوں کی صف میں کھڑا دیکھنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ تھی ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان پر بھارتی فوجوں نے قبضہ کیا تو احمد شمیم کا زخموں سے بھرا دل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اس رات ان کی کیا حالت تھی وہ ساری رات دیوانوں کی طرح گھومتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو شدید اعصابی تناؤ کے باعث دل کا پہلا دورہ پڑا۔ اس وقت سے وہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے کیونکہ ان کا دل اور ایمان پاکستان تھا، جب وہ دو ٹکڑے ہوئے تو ان کے دل میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔

شمیم کو میں نے زندگی میں دو بار روتے دیکھا۔ ایک اس وقت جب سقوط ڈھاکہ ہوا۔ راولپنڈی کے سی۔ جی۔ ایچ ہسپتال میں داخل کیا گیا، وہاں دو آدمی تھے۔ ایک تو احمد شمیم ___ اور دوسرے یوسف ظفر۔ اُردو کے نامور شاعر اور تراڑکھل ریڈیو کے ڈائریکٹر تھے۔ آفتاب اقبال شمیم، جمیل ملک اور یونس منصور ان سب نے کئی راتیں ہسپتال میں شمیم کے ساتھ گزاریں۔ دل کا دورہ بہت شدید تھا۔ وہ

اپنی ول پاور ___ اور دوائیوں کی مدد سے صحت یاب ہوئے۔

وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ انہیں زندگی سے محبت تھی۔ وہ مکمل بھرپور زندگی جینا چاہتے تھے۔

دوسری مرتبہ میں نے شمیم کو روتے دیکھا، جب سری نگر سے خبر آئی کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ ۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے۔ ہماری شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔

مجھے فون کیا، مجھ سے ملو۔ دیکھو کوئی تاریخ نہ ڈالنا۔

دوسرے دن میں کالج سے واپسی پر شمیم سے ملی۔ پوچھا کیا بات ہے؟

خاموشی سے وہ خط جو سری نگر سے آیا تھا، میرے سامنے کر دیا اور ساتھ ہی بولے، منو! میری ماں مر گئی ہے، میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ تیرے علاوہ مجھے کوئی نظر نہیں آیا جس سے میں اپنا دکھ بانٹ سکوں اور رونا شروع کر دیا۔

میں نے بہت تسلی دی۔ اور کہا میں ہوں نا تمہارے ساتھ ___

لیکن وہ اس دن اتنے بے بس اور دکھی تھے، کہ میں بھی رونے لگی۔ حالانکہ میں نے اُن کی ماں کو نہیں دیکھا تھا لیکن ان کا ذکر شمیم سے اتنا سن چکی تھی کہ اُن کا دکھ اپنا دکھ لگا۔

بولے، منو! آج میں کیوں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے زندگی ایک ایسا زخم بن گئی ہے، جس کا تو بھی مداوا نہیں کر سکتی۔ میں تنہا ہوں۔ میری ماں مجھے دکھ کی زنجیر میں باندھ کر خود تو آزاد ہو گئی ہے اور اپنے سارے غم میرے حوالے کر گئی۔

ماں کا آخری دیدار نہ کرنے کا غم اس کے لیے ایک مستقل روگ بن گیا۔

۱۹۷۵ء میں احمد شمیم ناظم اطلاعات آزاد کشمیر مقرر ہوئے اور مظفر آباد چلے گئے تو آپ کی ذہانت، راست گوئی، علم و دانش اور شہرت ہی اُن کی دشمن بن گئی۔ ۱۹۷۸ء میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ضیاء الحق نے جب میر پور آزاد کشمیر کا دورہ کیا اور اس دورے پر اُٹھنے والے اخراجات کی رقم حکومت آزاد کشمیر نے احمد شمیم کے سپرد بحیثیت ناظم اطلاعات دی تو حکومت کے ایک بدعنوان سیکریٹری نے اس رقم میں سے دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا بصورتِ دیگر سنگین نتائج کی دھمکی دی گئی۔ لیکن احمد شمیم کی آزاد ضمیری نے دھمکی کی قطعاً پرواہ نہ کی اور سیکریٹری کے مطالبے کو رد کر دیا۔

اس کے بعد احمد شمیم کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ ان کے خلاف جان بوجھ کر تحقیقات کروائی گئیں مگر ان کا دامن مکمل طور پر ان بدعنوانیوں کے داغ سے پاک تھا۔ اس لیے یہ تحقیقات بے نتیجہ رہی مگر اس دوران انہیں بہت کوفت اُٹھانا پڑی۔ کمیشن کے سربراہ بریگیڈیئر عارف نے خاص طور پر شمیم کے کردار کی

تعریف کی اور انہیں انتہائی ذہین، قابل اور دیانت دار افسر قرار دیا لیکن بدعنوان عناصر نے اس پر ختم نہ کی اور نئی تگ و دو کے ساتھ احمد شمیم کے خلاف اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے دوبارہ نائب ناظم اطلاعات کے عہدے سے تنزلی کروائی جس کے خلاف احمد شمیم نے ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی۔ ہائی کورٹ نے احمد شمیم کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس طرح عدالت نے انہیں ڈائریکٹر اطلاعات برقرار رکھنے کا فیصلہ دیا۔ اس طرح اپنی صاف دلی اور دیانتداری سے پھر سرخرو ہوئے، لیکن اس گھٹیا الزام نے ان کے دل پر کاری ضرب لگائی اور انہیں دوبارہ دل کا دورہ پڑا۔

سیکریٹری اطلاعات و نشریات پاکستان جناب لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن، شمیم کے کردار اور احساسات و جذبات سے پوری طرح آگاہ تھے اور کشمیر سے احمد شمیم کی محبت ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ریڈیو صدائے کشمیر میں جناب مجیب الرحمٰن، احمد شمیم کے ساتھ کام کر چکے تھے لہٰذا انہوں نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا اور احمد شمیم کو ایک قومی ہیرو کا خطاب دیا۔

اسی دوران ان کو عارضۂ قلب کی دوبارہ تکلیف شروع ہوئی کیونکہ انہیں بار بار مظفرآباد اور پنڈی کے چکر لگانا پڑتے تھے۔ ان کی صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ پہاڑی راستوں پر سفر کریں لیکن اتنی تکلیفوں کے باوجود انہوں نے اپنے تخلیقی سفر میں ستانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

احمد شمیم کی بیماری میں شدت آ گئی۔ آخرکار اسی کشمکش میں جواں سال شاعر نے مرنے سے قبل مجھے آکسیجن ٹینٹ میں جو الفاظ کہے تھے وہ یہ تھے:

''منیرہ! مجھے تیرا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔''

یوں ۷/اگست ۱۹۸۲ میں احمد شمیم نے اپنی روح کے پاتال میں سب سے گہرا غوطہ لگایا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور ایک زندگی افروز خوشبو ہجرت کر گئی ___ !

مرا دل خرابۂ غم میں نیم جاں ہو کے اونگھتا ہے
نہ کوئی نغمہ، نہ کوئی آہٹ
نہ کوئی غمزہ، نہ مسکراہٹ
بس ایک دلدوز بیکراں خامشی ہے ہر سُو!

احمد شمیم کی تصانیف اور ناقدین کی آرا

۱۔ اجنبی موسم میں ابابیل (طویل نظمیں)

۲۔ ریت پر سفر کا لمحہ (مختصر نظمیں)

۳۔ وگ تہٕ داغ (کشمیری شاعری)

۴۔ ریگِ زرد کے اس پار (زیرِ طبع۔غزلیات)

۵۔ ہوا نامہ بر ہے (خطوط)

۶۔ڈرامہ (ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھے)

۷۔افسانہ (مختلف رسائل میں شائع ہوئے)

۸۔مضامین (مختلف رسائل میں شائع ہوئے)

احمد شمیم کی زندگی میں ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ کچھ وسائل محدود ہونے اور کچھ فراغت کا میسر نہ ہونا اور پھر زندگی نے بھی وفا نہ کی ___

احمد شمیم نے اُردو، انگریزی اور کشمیری زبان میں لکھا۔ اپنی پُر اثر شاعری اور انقلابی خیالات کے باعث ادبی حلقوں کی جان بن گئے۔ ترقی پسند نظریات رکھنے کے باعث ترقی پسند حلقے سے ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ احمد شمیم نے مختلف اخبارات، رسالوں اور ماہناموں میں لکھا۔ لاہور سے جناب احمد ندیم قاسمی کی زیرِ ادارت نکلنے والے ماہنامہ 'فنون' میں بھی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ احمد شمیم کو عوامی حلقوں میں جو زبردست پذیرائی حاصل ہوئی وہ ان کی مشہور نظم 'کبھی ہم خوبصورت تھے' کے باعث ہوئی۔ یہ نظم ان کی پہچان کا خوبصورت حوالہ ہے۔

احمد شمیم کا سرمایہ جو نظموں، غزلوں اور نثری شکل میں بکھرا پڑا تھا، میں نے اکٹھا کیا۔ خطوط اور نظموں کا انتخاب کر کے ان کی کتابیں شائع کروائیں۔

''اجنبی موسم میں ابابیل'' (شعری مجموعہ) ''ریت پر سفر کا لمحہ'' (شعری مجموعہ) ان کے علاوہ ایک مجموعہ 'وگ تہٕ داغ' کشمیری زبان میں سری نگر سے شائع ہوا۔

''ہوا نامہ بر ہے'' کے نام سے خطوط شائع کرائے۔

اجنبی موسم میں ابابیل

اس کتاب میں ۱۵ طویل نظمیں ہیں جنہیں میں نے کوشش اور پوری توجہ کے ساتھ منتخب کیا اور نظموں کا انتخاب کر کے انہیں کتابی صورت دی۔ یہ کتاب ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا پیش لفظ جمیل ملک نے لکھا اور احمد شمیم کی شاعری کا تعارف آفتاب اقبال شمیم نے لکھا، جبکہ اختتامیہ احمد ظفر نے تحریر کیا۔ کتاب کے فلیپ پر احمد ندیم قاسمی کی رائے درج ہے۔ کتاب کا تعارف میں نے لکھا۔ کتاب کا انتساب احمد شمیم کی والدہ کے نام احمد شمیم کے الفاظ میں درج ہے:

''ازل صفت ماستا کے نام''

دھوپ اچھی ہے

پیڑ پیارے ہیں

اور سر پر تنے ہوئے آسماں کی چادر میں

پیاری امی کی شال کی سی مہک رچی ہے

''اجنبی موسم میں ابابیل'' کے پیش لفظ میں جمیل ملک لکھتے ہیں:

''احمد شمیم کے ہاں وقت کے بسیط تناظر میں سانس لیتے ہوئے ایک فرد کی اکائی اپنے عہد کی اجتماعی تحریکوں اور داخلی و خارجی نظریوں سے اس طرح دست و گریباں ہے کہ جب تخلیق کا جامہ زیب تن کرتی ہے تو بیک وقت زندگی کی تمام سطحوں کی ترجمان بن کر ابھرتی ہے ___ اور یہ صلاحیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کا سماجی شعور اتنا ارتقاء یافتہ ہو کہ اسے تاریخی عمل اور معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنے والے عوامل کا پورا پورا احساس ہو۔'' (۵)

آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں:

''احمد شمیم جبر کی شناخت دو سطحوں پر کرتا ہے۔ جبر جو انسان کا مقسوم ہے جو ایک فرد اور ایک نسل کو فنا کر دیتا ہے لیکن افراد اور نسلوں کے دریا کو بہنے دیتا ہے جو عمروں اور موسموں کے دائرے میں ہونے اور نہ ہونے کی تماشہ گری کرتا رہتا ہے۔ جہد و بقا کا کھیل رچائے رکھتا ہے۔'' (۶)

احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''احمد شمیم کی طویل نظمیں بلاغت کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔ یہ نظمیں ایک آزاد

اور پاکیزہ روح کا سفر نامہ حیات ہیں ۔ اور مصرعے مصرعے اور لفظ لفظ میں
زندگی کے ایسے پہلو روشن کرتی چلی گئی ہیں جو بڑے بڑے فنکاروں کی توجہ سے
بھی بچ گئے مگر جن کے بغیر زندگی تشنہ اور ادھوری رہ جاتی ہے۔ یہ نظمیں اُردو کے
شعری ادب میں آئندہ صدیوں تک زندہ رہنے والے اضافے ہیں۔" (۷)

ریت پر سفر کا لمحہ

۱۹۸۸ء میں دوسرا مجموعۂ کلام 'ریت پر سفر کا لمحہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں ۷۲ نظمیں ہیں۔ اس کا انتساب شمیم نے میرے نام (منو کے نام) کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مجموعہ کے آغاز میں سردار محمد عبدالقیوم خان (صدر آزاد کشمیر) کا مضمون ہے۔ اس کے علاوہ احمد شمیم کا مضمون "اثاثے" کے نام سے شامل ہے۔ اس کتاب کی تقریب رونمائی مظفر آباد میں مارچ ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ (حرف نیم رس) میں نے لکھا ہے۔ جس کی چند سطریں:

"ہر انسان کے تحت الشعور میں اس کا بچپن چھپا ہوتا ہے ۔ دنیاداریوں اور منافقتوں سے پاک بچپن اور جب ایسا ہوتا ہے تو انسان عمر کے آخری حصے تک بچپن کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ دنیا نے انہیں دکھ بھی دیئے اور اعلیٰ افسری کا منصب بھی، شاعر، افسانہ نگار اور اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود وہ ایک معصوم شخص اور سچے شاعر کی طرح جستجو میں گم رہے اور اپنی فطرت کے اولین نقش کی تلاش میں مضطرب پھرتے رہے۔

انسان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اس کی زندگی ہے اور ایسی زندگی جس میں احساس اور شعور ہو، ایک سوچنے والے ذہن کے لیے عذاب سے نجات کی صورت موت بن جاتی ہے۔

احمد شمیم معاشی اور معاشرتی ناہمواری، رنگ و نسل کے امتیاز اور انسان پر غلبے کے خلاف ایک ایسے جہاں کی تلاش میں ہیں جہاں عدل ہو، مساوات ہو اور امن ہو، ایسی ہی سوچوں میں احمد شمیم دکھوں کے بے انت سفر میں تنہا نظر آتے ہیں۔" (۸)

کتاب کے شروع میں سردار عبدالقیوم خان (صدر آزاد کشمیر) لکھتے ہیں:

"احمد شمیم ہماری سرزمین کا مخلص اور باصلاحیت آفیسر تھا۔ تحریک حریت کشمیر سے

اپنی تحریر اور تقریر سے وابستہ رہا۔ وہ اپنی منفرد طبیعت کی بناء پر ظلم اور جبر سے
سمجھوتہ نہ کر سکا اور اس کشمکش میں وہ ابدی نیند سو گیا وہ ہم سے جسمانی طور پر تو
الگ ہو گیا ہے لیکن اس کا چھوڑا ہوا تحریری ورثہ ہمارے لیے اس کی یاد ہر دم تازہ
کرتا رہے گا۔(۹)

دگ تہ داغ

احمد شمیم کا چوتھا مجموعۂ کلام 'دگ تہ داغ' کے نام سے جو کشمیری زبان میں لکھی گئی ۲۳ غزلوں اور دو گیتوں پر مشتمل ہے۔(جو کشمیری عورتیں عموماً گھریلو کام کاج کے دوران گنگناتی رہتی ہیں) یہ تصنیف جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر میں جناب محمد یوسف ٹینگ کے زیر ادارت شائع ہوئی۔ اس مجموعے کی اشاعت ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔

ریگ زرد کے اس پار(غزلیں-زیر اشاعت)

احمد شمیم کا پانچواں مجموعۂ کلام "ریگِ زرد کے اس پار" جو غزلوں پر مشتمل ہے اور زیر اشاعت ہے اس میں غزلوں کی تعداد ۷۵ ہے۔
احمد شمیم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے غزلیں بھی بہت خوبصورت اور جاندار کہی ہیں۔ احمد شمیم کی نظم و غزل دونوں میں ان کے یہ احساسات و جذبات اپنی تمام تر شدت کے ساتھ موجود ہیں۔

"ھوانامہ برھے"

۱۹۹۵ء میں شمیم کے خطوط (جو انہوں نے مجھے لکھے تھے) "ہوا نامہ بر ہے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس کتاب ۲۸۰ صفحات ہیں۔
نثر کا سب سے خوبصورت نمونہ ان خطوط میں ملتا ہے۔ یہ خطوط یقیناً اردو خطوط نویسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ ان میں احمد شمیم ایک حساس، محبت کرنے والے، کھرے اور صاف گو انسان اور مخلص دوست نظر آتے ہیں۔
اس کتاب کا پیش لفظ جمیل ملک اور فلیپ احمد ندیم قاسمی نے لکھا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

احمد شمیم ہمارے دور کا ایک بڑا شاعر تھا۔ مگر منیرہ کے نام اس کے یہ خطوط پڑھ کر ادب کے پرستاروں کو اندازہ ہوگا کہ احمد شمیم ایک بڑا نثر نگار بھی تھا۔ ان خطوط میں اظہار کے کسی تکلف کو روا نہیں رکھا گیا بلکہ آشفتگی کا، سپردگی کا، تنہائیوں کے کرب واندوہ کا اور ملاپ کی بے کار تمناؤں کا اتنا کھرا اظہار کیا گیا ہے کہ دل و دماغ کے آفاق پر روشنیاں طلوع ہونے لگتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں احمد شمیم کے خطوط کا یہ مجموعہ محبت کی معصومیت اور بے لوثی کو عام کرے گا اور اردو کے نثری ادب میں غیر فانی اضافہ ہوگا۔(۱۰)

پیش لفظ میں جمیل ملک کا مضمون ''انگلیاں فگار اپنی'' میں لکھتے ہیں:

''منیرہ کے نام احمد شمیم کے لکھے ہوئے خطوط بیشتر ان کی شادی سے پہلے کے زمانے یعنی عالمِ فراق میں لکھے ہوئے ہیں جن میں سے بعض تو محض علامتی طور پر ہی خونِ دل سے نہیں بلکہ حقیقتاً رگ جسم وجاں میں نشتر چبھو کر لکھے گئے ہیں۔ اسی لیے ان خطوط میں جدائی سے وصال تک لمحوں کی وہ ساری تڑپ وہ سارا گداز، وہ سارا جمال موجود ہے جس کا سراغ کسی ایسے فنکار کے قلم ہی سے لگایا جا سکتا ہے جس نے واقعی اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئی ہوں۔''(۱۱)

ڈرامہ

احمد شمیم نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔

۱۔سیپ، سمندر اور ساحل ۔ ۱۹۷۵ء میں ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا، جس کی ہدایات و پیشکش عون محمد رضوی کی تھی۔ یہ ڈرامہ جشنِ تمثیل میں پیش کیا گیا۔ اس پر ایوارڈ ملا۔

۲۔لمحہ بہ لمحہ۔ (تاریخ یاد نہیں)

۳۔سحر قریب ہے۔(قسط وار ڈرامہ تھا۔ غالباً ۱۹۷۶ء میں پیش کیا گیا۔)

۴۔ریت پر سفر

ریڈیو کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے۔ جن میں سب کے نام یاد نہیں۔ کچھ نام جو یاد ہیں وہ ذیل درج ہیں

۱۔ایک ندی دو کنارے

۲۔ گھر کا رستہ بھول گیا (منظوم تکمیل)
۳۔ لمحہ جوابدہ نہیں

افسانہ

احمد شمیم کے افسانے مختلف رسائل فنون، نقوش، کشمیر وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ جن کو یک جا کر کے افسانوں کے مجموعہ کی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کر رہی ہوں

مضامین

احمد شمیم نے مضامین بھی لکھے ان میں کتابوں پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ ان مضامین کو بھی اب تک کتابی شکل نہیں مل سکی ہے۔ کوشش کر رہی ہوں کہ جلد ہی ان کو کتابی شکل میں شائع کراؤں۔

ایوارڈ

(۱) ۱۹۷۵ء میں ٹیلی وژن ڈرامہ فیسٹیول جشنِ تمثیل میں احمد شمیم کے ڈرامے "سیپ، سمندر اور ساحل" کو ایوارڈ ملا۔

(۲) ۱۹۹۳ء میں آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل نے احمد شمیم کو بعد از مرگ ایوارڈ سے نوازا۔

(۳) وزیرِ اعظم پاکستان شوکت عزیز صاحب نے ۲۰۰۵ء میں احمد شمیم کو بعد از مرگ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ نے دیا۔

(۴) صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان صاحب آزاد کشمیر گورنمنٹ کی طرف سے ۲۰۰۶ء میں احمد شمیم کو بعد از مرگ نے ایوارڈ دیا۔

احمد شمیم کی نظمیں

حلقۂ ارباب ذوق نے احمد شمیم کی نظموں کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے ایک نشست کا اہتمام کیا تھا۔ اس اجلاس میں پڑھی جانے والی تحریروں کو" ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو" کے نام سے کتابی شکل دی گئی۔

اس کتاب کا پیش لفظ فتح محمد ملک صاحب نے لکھا۔ وہ پیش لفظ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"حالات کی ستم گری کے باعث احمد شمیم کے تمام تر تخلیقی امکانات بروئے کار نہ آ سکے اور وہ ایک ایسے وقت ہماری محفل ادب کو ویران کر گئے جب ان کا تخلیقی جوہر اپنے کمال پر تھا۔"

یہ کتاب ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے شروع میں شمیم کی مشہور نظم 'ریت پر سفر کا لمحہ' اور ان کا وہ آخری نثری مضمون ہے جو 'اثاثہ' کے نام سے اخبارات میں شمیم کی زندگی میں چھپ چکا تھا۔ اس کتاب میں احمد شمیم کی نظم" بانجھ لمحوں میں مناجات" کا فنی تجزیہ آفتاب اقبال شمیم صاحب اور احمد داؤد صاحب نے الگ الگ کیا۔

آفتاب اقبال شمیم لکھتے ہیں:

"احمد شمیم کی اس طویل نظم کا موضوع اس عورت کا المیہ ہے جسے زمانے کے جبر اور معاشرے کے استحصال نے بنجر اور بانجھ بنا دیا ہے۔ یہ عورت زندگی کی قوتِ نمو کا افضل ترین اظہار اور زندگی کی تگ و دو کا ثمر ہے۔ یہ آج کی عورت اتنی ہی قدیم ہے جتنی زمین کی زرخیز مٹی۔ اس کی خواہش تخلیق اور ماں بننے کی تڑپ خود زندگی کی ہی اُمنگ ہے جس کے وسیلے سے وہ وجود کے اعلیٰ تر منصب پر پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ عورت زندگی کا ہی تمثیلی تشخص ہے جس کے طبعی وجہ کی اساس اس کی جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی اقدار پر ہے۔ یہ عورت زمانے، تاریخ اور معاشرے کے جبر کی زد میں آ کر فاحشہ بن جاتی ہے لیکن اس کا وجود اوراک اسے اپنی اصل سے منقطع نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنی ذات کے جوہر میں رابعہ اور مریم کی طرح مقدس رہتی ہے۔ (۱۲)

احمد داؤد لکھتے ہیں:

"بانجھ لمحوں میں مناجات" احمد شمیم کی ان چند طویل نظموں میں سے ایک ہے جنہیں پڑھ کر نئی نظم،

فکری، تکنیکی اوراسلوبی امکانات کی وسعت کا احساس ہوتا ہے۔طویل نظم شاعر کے لیے ایک تکنیکی امتحان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا تجربہ بھی ہوتا ہے جس میں شاعر کے تخلیقی جوہر ورتبہ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اُردو شاعری میں طویل نظم کہنے والے شاید اسی لیے کم ہیں۔ احمد شمیم اس اقلیت میں منفرد اور نمایاں ہیں۔'بانجھ لمحوں میں مناجات'، یہ نظم اپنے کینوس کے اعتبار سے اس زمانی تقسیم سے بالا ہے۔ اس کا موضوع صدیوں کی انسانی جدلیات پر محیط ہے۔ پیکر تراشی، ترسیل معانی، خیال کا پھیلاؤ، شخصی تجربہ، الفاظ کی بنت اور ذات کی بنیاد بنا کر ذات سے باہر پھیلے مظاہرات کی شاعرانہ تسخیر نے اس نظم کو آج کے انسان کی کرب انگیز آرزو بنا دیا ہے۔

احمد شمیم کے پیکر شاعرانہ مصوری کے ایسے نمونے بن جاتے ہیں، جن کے پس منظر میں انسانی جذبہ زندگی کی امنگ اور تخلیق نو پر مکمل ایمان کارفرما ہوتا ہے۔ اس نظم میں کئی بار احمد شمیم نے:

ان جنی نسل کا ہر راز میری کھوکھ میں ہے
ہر اک نسل تیری کھوکھ میں ہے

کہہ کر انسانی تخلیق کے مسلسل عمل کی نشاندہی کی ہے۔'بانجھ لمحوں میں مناجات' دراصل آج کے انسان کی مناجات ہے۔ احمد شمیم نے تاریخی استعاروں کو زمانی کیفیات سے جوڑ کر موجودہ ہنگامہ خیزی میں اس ابدی آرزو تک رسائی حاصل کی ہے جو حسن، امن اور آزادی کی تکمیل کا باعث بنتی ہے۔ نظم کی چند سطریں:

سب وہی لفظ ہیں ___ ہاتھوں سے پرے ہاتھ
مگر کچھ بھی نہیں
پرام بوڑھا ہے ایڈیٹر کی سسکتی ہوئی سوچ
میز پر میں ہوں، میرے جسم کے ہر ریشے میں
ایک اخبار ہے چھپ جائے تو خبریں پڑھنا
اے ہری فصل میرے جسم میں آ
میرے صحرا کی میری ریت کی آواز، میں اک کونج اُڑے
اور وہ کونج اُڑے مرے اندر کے کسی ٹیلے سے
اور دھندلاتی ہوئی دور فضا میں ڈوبے
وہ فضا جسم ہو میرا، تیرا
دودھ بکور، شفق مینارے
اور مینارے پہ دو آنکھیں ہیولے سے تجھے

اور مجھے دیکھتی ہیں
دھوپ سائے میں گھلے!
چپ میری چیخ ہے ___ میرے باہر ،
میرے اندر، میری رگ رگ میں سلگتی ہوئی، بجھتی ہوئی اُڑتی ہوئی
ہاتھ کو نبضیں جو نہ تھیں
گذرگہ کے گڑ میں کوئی اک عمر سے ٹپکتا ہے
ویت نامی کا لہو ___ ایک مقدس تحریر
اور سب وہم ___ سبھی وہم، ہزاروں شکلیں
ایک ہی شکل کی تقسیم
کلب، بار، گٹر
کار، گذرگاہ، گپھا
اے گواہی کے نہ بولے ہوئے لفظوں کی سزا (۱۳)

ان کے علاوہ مضامین لکھنے والوں میں جناب سجاد حیدر ملک نے 'تار پر چلنے والا' جناب منصور قیصر نے ' ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو' جناب نثار ناسک نے 'میرا دوست میرا دشمن' رشید نثار نے 'احمد شمیم تغیر و انقلاب کے آئینے میں' مسعود ساحر 'احمد شمیم میرا دوست' مظہر الاسلام نے 'میں آپ اور وہ' کے عنوانات سے مضامین لکھے ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس میں شمیم کے چاہنے والوں نے اپنے غم کا اظہار شعری ادب میں بھی کیا ہے۔

اردو نظم کی روایت

احمد شمیم کا نام جدید اردو نظم کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے مختصر اور طویل نظمیں کہیں۔ شمیم کی جدید نظم پر بحث کرنے سے پہلے نظم کا مفہوم واضح کرنا ضروری ہے اور جدید نظم کو قدیم نظم نگاری کی روایت پر نظر ڈالے بغیر بیان کرنا ممکن نہیں۔

دنیا کی ابتدائی تحریریں جنہیں جادو اور سحر کے عہد سے منسوب کیا جاتا ہے وہ شاعری کی صورت میں ملتی ہیں۔ گویا انسان نے اظہار کا پہلا وسیلہ جو اپنے لیے چنا وہ شعری اسلوب تھا۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح اُردو ادب کا آغاز بھی شاعری سے ہوا جس کے ابتدائی نقوش امیر خسرو اور بھگت کبیر کے دوہوں میں ملتے ہیں اور مثنویاں، قصائد، مرثیے اور غزل لکھی جانے لگی۔ جہاں تک قصائد اور میراثی

کا تعلق ہے اس میں شخصیات کا ذکر ہے جو اظہار عقیدت کے حوالے سے ملتا ہے۔ مثنویاں عام طور پر کسی محبت کی کہانی پر مشتمل ہوتی ہیں جبکہ غزل اپنے مخصوص مزاج اور زبان کی وجہ سے محض واردات قلبی اور تصوف کے اظہار کا ذریعہ ہے۔

لیکن جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو اس کے لیے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی ہیئت معین ہے۔

پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

"نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور جن میں بیانیہ، فلسفیانہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور داخلی یا دونوں قسم کے تاثرات پیش کیے ہوں، اگر ہم چاہیں تو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ان نظموں کو بہت سی شاخوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔" (۱۴)

جب انگریزوں نے اپنے پاؤں ہندوستان پر جمانے شروع کیے اس وقت شہر آشوبوں کی صورت میں سماجی نظم نگاری نے جنم لیا۔

نظیر اکبر آبادی سے اردو نظم میں ایک نئی روایت کی ابتداء ہوئی۔ نظیر کی نظموں نے زندگی کی لاتعداد راہیں روشن کیں۔ انہوں نے ہر موضوع پر نظم کہی۔

نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں شگفتگی کی کلیاں جابجا کھلی ہوئی ہیں اور ان کے نزدیک سارے انسان برابر ہیں۔ اس لیے ظلم کا بازار بند ہونا چاہیے۔ مثلاً کہتے ہیں۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی (۱۵)

جدید نظم گوئی کا آغاز انجمن پنجاب سے ہوا جس میں مختلف موضوعات پر لوگوں سے نظمیں کہلوائیں گئیں اور حالی، شبلی، اکبر اور اسماعیل میرٹھی کے ساتھ اقبال کی آواز میں بھی جدید اردو شاعری کی فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ زندگی کے مختلف پہلو نسبتاً گہرائی سے پیش کیے جانے لگے۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر اقبال ہیں۔ اقبال نے بین الاقوامی معاملات و مسائل کو سامنے رکھ کر موجودہ زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالی۔ سرمایہ، محنت، غلامی، آزادی سب کا تجزیہ کیا اور بندۂ مزدور کو خواب سے بیدار ہونے کا پیام بھی دیا۔

اس نظم میں اقبال اپنی قوم کو انقلاب کی نوید دیتے نظر آتے ہیں۔

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمہ بیداری جمہور ہے سامان عیش
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

(خضر راہ ۔ بانگ درا)

اقبال کے تفکر کے نتیجے کے طور پر اقبال کے بعد نظم میں ایک رومانیت کی لہر بھی آئی جب بعض شعراء نے شعر و ادب کی مقصدیت سے قطع نظر کر کے شعر کو جذبات کے ارتعاش ساوی سے تعبیر کیا جن میں اختر شیرانی، عظمت اللہ خان، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے شعراء تھے ان کے بعد ساغر نظامی، اختر انصاری اور احسان دانش وغیرہ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور رومانی شعراء نے بہت سے نئے قلعے سر کئے۔ عظمت اللہ خان نے عورت کے سراپا کے بیان اور اپنے ذاتی جذبات و تاثرات کے اظہار میں مقصد شاعری بنایا اور معاشرے کے اخلاقی معیاروں سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ اختر شیرانی نے متوسط طبقے کی دوشیزہ کو معشوقہ بنا کر اور اس کا نام لے کر شعر کہنے کی روایت کا آغاز کیا اور اُردو نظم کو ایک نیا رخ دیا۔

جوش ملیح آبادی حسن پرست جذباتی شاعر کے طور پر اُبھرے ۔ حفیظ جالندھری نے ہلکی پھلکی، خوبصورت لطیف جذباتی اور رومانی گیت نما نظمیں لکھیں اور احسان دانش نے مزدوروں پر توجہ دی۔ اگر چہ اس سے پہلے اقبال نے بندہ مزدور کو غفلت سے جگا دیا تھا۔

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

پھر آزاد نظم شروع ہوئی جس کا آغاز پنجاب کے شعراء نے کیا جن میں تصدق حسین خالد، ن ۔م ۔راشد، میرا جی نے باقاعدہ طبعزاد آزاد نظمیں لکھیں ۔ن ۔م ۔راشد کے علاوہ فیض، قیوم نذر، مختار صدیقی، یوسف ظفر، منیر نیازی، وزیر آغا، ساحر، افتخار جالب، اختر حسین جعفری، احمد شمیم، آفتاب اقبال شمیم، احمد فراز، ندیم قاسمی، افتخار عارف، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر وغیرہ نے نظم کو عصری مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

احمد شمیم جدید نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی نظم نگاری اس دور میں شروع ہوئی جب دنیا انقلاب کی زد میں تھی اور سیاسی وسماجی حالات شعروادب پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے۔ اس دور کے حالات کے پیش نظر آزاد نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ زیادہ تر نظم ترقی پسند شعراء نے کہی۔ احمد شمیم ایک محب وطن کشمیری تھے۔ معاشرے میں پھیلی ناانصافیاں انہیں بھی مضطرب کرتی تھیں اور اسی اضطراب کو انہوں نے اپنی شاعری میں منعکس کیا۔ جب انہوں نے شاعری کی تو ترقی پسندوں کی اشتراکی حقیقت نگاری نے انہیں بھی متاثر کیا۔ اگرچہ وہ باقاعدہ طور پر ترقی پسند تحریک کے رکن ہی نہ تھے بلکہ وہ ذہنی طور پر بھی تحریک کے حامی تھے لیکن فنی طور پر اس سے الگ تھے۔

پروفیسر سرور کامران کہتے ہیں:

> ''وہ ترقی پسند تحریک کے مسائل کے فنی اظہار سے خود کو وابستہ نہیں کرتا تھا لیکن وہ ترقی پسندوں کے نظریات سے بے حد متاثر تھا اور اکثر نجی محفلوں میں ان کے حق میں زبردست دلائل دیا کرتا تھا اور اپنے آپ کو ذہنی طور پر ترقی پسندوں سے منسلک خیال کرتا تھا۔''(۱۶)

آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں:

احمد شمیم مارکس کے نظریات سے متاثر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سماج میں دو ہی طبقے ہیں۔ ایک عیش کرنے والا اور ایک suffer کرنے والا جبکہ اور suffering کو محسوس کرنے والے ہی دراصل suffer کرتے ہیں۔

احمد شمیم کی ترقی پسند تحریک سے ذہنی وابستگی کی توثیق ان کے بھی رفقاء کرتے ہیں اور خود ان کی نظم میں ہمیں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ لہٰذا احمد شمیم کی نظم کا جائزہ لینے سے پہلے ترقی پسند تحریک کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ اس تحریک کے نظریات کی روشنی میں احمد شمیم کی شاعری زیادہ واضح نظر آئے گی۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز میں جو اعلان کئے گئے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادب اور آرٹ کو دقیانوسیوں سے بچائیں۔ فنون لطیفہ کو عوام کی زندگی کے قریب لے آئیں تا کہ وہ حقیقتوں کو پیش کرنے کے ساتھ مستقبل کی دنیا کی طرف ہماری رہبری کریں اور ادب جو ہم میں تنقیدی قوت پیدا کرے وہ عقل کی روشنی میں ہمارے رسم ورواج کی جانچ پڑتال کرے۔(۱۷)

فیض احمد فیض نے لکھا:

''ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے۔ میراجی حلقۂ ارباب ذوق کے شعراء میں سب سے نمایاں ہیں۔ ان کے ہاں جنس پرستی کا رجحان غالب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں ایک پُراسرار دیومالائی فضا ملتی ہے۔ میراجی بظاہر زندگی سے دور بھاگتے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی سے پوری طرح ہم آغوش ہیں ورنہ اقدار کے خوفناک تصادم اور آویزش کو اپنی شاعری میں منعکس نہ کرتے۔ ان کی گیت نما نظمیں، ہندی گیت کی فضا لیے ہوئے ہیں۔ نظم میں ہیئت کے تجربات کے متقاضی ہیں۔ احمد شمیم کی نظم میں ہمیں میراجی کی نظم کا اثر بھی نظر آتا ہے اور ترقی پسندوں کی حقیقت نگاری کا پرتو بھی۔

میراجی کا اثر احمد شمیم پر جو تھا وہ ہیئت و اسلوب کی تحصیل و انجذاب تک تھا۔ فکری اور ذہنی طور پر وہ قطعاً میراجی سے متفق نہ تھے۔ وہ مستقبل اور انسان کی عملی جدوجہد پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔ ماضی ان کے لیے قوت کا سرچشمہ، حال ان کے لیے جدوجہد کا اعلامیہ اور مستقبل روشن خوابوں کی دنیا تھا۔ جبکہ اس کے برعکس میراجی کسی مستقبل سے وابستہ نہیں تھے اور ماضی و حال بھی ان کے لیے بے معنی تھا۔'' (۱۸)

ڈاکٹر جمیل جالبی میراجی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بے یقینی، بے روزگاری اور بے معنی رسمی اخلاقیات سے برگشتگی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت بھی تھی اور احساس کا حصہ بھی۔ خود میراجی کے اپنے الفاظ میں: مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔'' (۱۹)

ترقی پسند تحریک کے آغاز سے اردو شاعری میں جہاں موضوعات میں بے پایاں اضافہ ہوا وہاں ہیئت کے تجربے نے ایک نئی اردو شاعری دی۔ احمد شمیم اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

احمد شمیم کی شاعری کی نظم گوئی کا جائزہ لینے سے پہلے ترقی پسند شاعری کی چند مثالیں ___

سجاد ظہیر اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

جب جیب خالی ہو
یا بیروزگاری ہو
قرض دینے والے آنکھیں دکھائیں
بیوی لڑنا اور طعنے دینا شروع کر دے
اور گھر کے بچے ہنسنا چھوڑ دیں
تب بھوک کتنی بھیانک ہوتی ہے۔(۲۰)

احمد ندیم قاسمی اپنی ایک نظم میں یوں مخاطب ہوتے ہیں:

مجھے حنوط کرو
کہ میں وہ جبر تھا جس کا کوئی جواب نہ تھا
وہ ظلم جس کی کوئی حد نہ تھی حساب نہ تھا
مجھے حنوط کرو
میں وہ چھری تھی جو ایمان تک اُتر جائے
وہ صرف جسم نہیں جان تک اُتر جائے (۲۱)

کیفی اعظمی۔اپنی نظم امکان میں لکھتے ہیں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلی ہے
سب اُٹھو، میں بھی اُٹھوں، تم بھی اُٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی (۲۲)

فہمیدہ ریاض کہتی ہیں:

اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن
کیوں ترے زخمی تن پہ اُگی
یہ فصل فقط سنگینوں کی (۲۳)

ریاض احمد لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک اگرچہ اپنے آپ کو براہِ راست سیاسی اور سماجی اقدار سے وابستہ قرار دیتی ہے لیکن بیشتر ترقی پسند فنکار جنسی اظہار کی حد سے آگے نہیں نکل سکے۔ان میں سب سے زیادہ کامیاب فیض ہے کہ وہ شعوری طور پر ایک جنسی یا

جمالیاتی تحریک سے سیاست کا رُخ کرتا ہے۔ مثلاً موضوع سخن میں اس نے
وضاحت کردی اور کہا:

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا (۴۳)

انہی شعراء نے جنسی جذبات کو شائستگی کے ساتھ بھی پیش کیا ہے مثلاً یوسف ظفر کی اس نظم میں ایک
خاص سماجی احساس ہے:

کئی انسانوں کا بے کار ہجوم
اپنے قدموں سے مسلتا ہے اُسے
انہیں انسانوں میں وہ جنس بھی ہے
جو کبھی ماں ہے، کبھی بیوی ہے
جس کی بیچارگی زیست کا راز
اس کے معصوم خدوخال میں

ان مثالوں سے متعلقہ شاعروں کی شعری عظمت پر روشنی نہیں پڑتی لیکن ترقی پسند شاعری کے مختلف
لہجے سامنے آتے ہیں جس سے احمد شمیم کا لہجہ پہچاننے میں مدد ملے گی۔

نظریہ اور زندگی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس میں روح اور جسم کا رشتہ ہے۔ ویسے بھی نظریہ
عمل کے بغیر بانجھ ہوتا ہے اس کا اظہار انسان کی ہر بات میں اور رویے میں ہوتا ہے۔ وہ یا تو زندگی کی نمو
بخش قوتوں کے ساتھ چلتا ہے یا ایسی طاقتوں کا ساتھ دیتا ہے جو وقت کا پہیہ گھمانے کی کوشش کرے
۔ تخلیق کار کا زندگی کے ساتھ نقطہ نظر جتنا واضح ہوگا اتنا ہی مکمل ابلاغ ہوگا کیونکہ اسلوب شخصیت کے
اظہار کا نام ہے۔ اس کی مثال جسم اور جلد کی سی ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

احمد شمیم کو جب ہم اس تناظر میں دیکھتے ہیں تو وہ اس عہد کے ایک سچے اور حقیقی تخلیق کار کے
طور پر سامنے آتے ہیں ۔ وہ عملی جدوجہد آزادی کشمیر میں شریک ہوئے ۔ ان کا ایک روشن
مستقبل پر ایمان تھا۔ انہیں اس بات کا شعور اور ادراک تھا کہ ظلم کی رات جتنی بھی لمبی ہو بالآخر نئی صبح
طلوع ہوگی ۔ وہ رنگوں کے جگنوؤں اور روشنی کی تتلیوں کے استعاروں کے حوالے سے نئے دن کی
نوید سناتے اور کہتے ہیں:

نئے دن کی مسافت
جب کرن کے ساتھ آنگن میں اُترتی تھی
تو ہم کہتے تھے ___ امی!

تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پر بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں، رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو!

یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے کہ انسان ایسے ماحول میں رہ رہا ہو جس میں سماجی تضادات اپنی مکروہ صورت میں موجود ہوں تو وہ گہری کالی رات میں صبح کے سنگیت کا گیت گا سکتا ہے یا وہ انسانیت کے بین الاقوامی استعارے استعمال کرسکتا ہے۔ ''روسی شاعر پشکن'' کے بارے میں خفیہ پولیس کے نمائندے نے رپورٹ دی تھی کہ یہ کسانوں کو بغاوت پر نہیں اُکساتا اور میلوں ٹھیلوں میں عجیب کپڑے پہن کر چلا آتا ہے اور عام لوگوں میں گھل مل جاتا ہے اور جب اس کا ملازم گھوڑے کو باندھنے لگتا ہے تو کہتا ہے کہ اسے کھلا چھوڑ دو آخر جانور کو بھی آزاد رہنے کا حق ہے۔ احمد شمیم انسانوں کے لیے حقیقی آزادی کا خواہش مند رہا ہے۔ چنانچہ روم کے سپارٹکس اور افریقہ کے لومبا کے حوالے سے کہتا ہے:

سپارٹکس سب غریب لوگوں کے میلے کرتوں میں اُجلی روحیں
تمہاری آواز میں تسلسل کی طرح
رستوں میں سولیوں پر لٹک رہی ہیں
ابھی تو پچھلے پہر کی دستک کا خوف
کمرے میں گونجتا ہے
اداس دہلیز پر لومبا کی سرکٹی لاش
کے حوالے سے ساری صدیوں کو دیکھتا ہے
سیاہ جسموں نے آخری لفظ
اور اپنی صلیب کے بوجھ سے جھکے بدن
ہم کہ شہر بے مقدر میں بس رہے ہیں
پرائی بستی کی بارشوں میں
ہوا کے بھیگے ہوئے بدن کو پکارتے ہیں
ہوا کا بھیگا بدن درختوں کو

سبز پتوں کی شال دے دے

(مصلوب روشنی کی شہادت :اجنبی موسم میں ابابیل)

تصدق حسین خالد، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، فیض وغیرہ کے ہاں موضوعات کا تنوع خاص طور پر موجود رہا۔ یہ شعراء ملک وقوم کے ایک حساس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں اور دل ودماغ ماحول کے ہر ارتعاش اور ہر نئے جلوہ کی تڑپ کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ احمد شمیم کے ہاں بھی ہمیں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے اوران کے رنگ میں رنگنے کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک نظم "دائرہ" میں لکھتے ہیں:

گئی رُت نے،
لہو میں تر پہ ترلاشیں
اٹھائی ہیں صلیبوں پر
تم اپنی آستینوں میں چھپائے
سرد سورج
منتظر بیٹھے ہو رستوں میں
بجھے بے جان سورج
کس کی آنکھوں سے
مہکتے رنگ دریا بہادیں گے!
ابھی زخموں کی پوشاکیں
ستم گر ناخنوں سے چاک ہوتی ہیں
ابھی آنکھوں کو
صحرا کی تپش کا کرب سہنا ہے!
ابھی دشمن کے آگے
ہاتھ پھیلا کر بلکنا ہے
ابھی تو راستے میں
زہر کا دریا بھی حائل ہے
بجھے سورج کے آئینے جلا کرنے سے کیا حاصل
لہو کی پیاس میں جلتے ہوئے یہ ریت کے ذرے
ہمارے چشم وگوش ولب کی تقدیریں
ہماری ہمسفر اس آرزو پر ہیں

کہ ہم بھی خون میں ڈوبی ہوئی لاشوں کی صورت
ان صلیبوں پر لٹک جائیں!

احمد شمیم کے ہاں ترقی پسندانہ مضامین ضرور ہیں لیکن وہ کھردری حقیقتیں نہیں بلکہ ان میں ایک مخصوص قسم کی لے پائی جاتی ہے۔ایک آہنگ ہے گویا احمد شمیم "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" دونوں کے دھارے تھامے رکھتے ہیں۔ان کی ایک طویل نظم کا ایک ٹکڑا پیش ہے:۔

__ مجھے نہ یوں نیم باز نظروں سے دیکھ اے جاں!
کہ یہ ادائے حسیں، خیال شکست توبہ کو اور مضبوط کر رہی ہے!
شکست توبہ کہ فتح اعجاز دلبراں ہے
__ تمہارا اعجاز حسن، سحر خموش و گویا
نگاہ کے روزنوں سے
پلکوں کی چلمنوں سے
دل محبت گزیدہ کو یوں پکارتا ہے
کہ جیسے بانگ جرس پکارے مسافروں کو
جسے خیال تلاش منزل ازل سے بے چین کر رہی ہے
___ ازل، ابد، زندگی بہانہ ہے ___ اک فسانہ
ازل اسیر خیال آدم
ابد فسون خیال انسان
حیات اک سایۂ گریزاں
دوام حاصل نہیں کسی کو بجز محبت
کہ یہ حکایت
طویل بھی ہے، جمیل بھی ہے!
ازل، ابد، زندگی بہانہ ہے
اور کیا ہے ___؟
یہ ساعت وصل حاصل عمر برق پا ہے!

(اجنبی موسم میں ابابیل)

ترقی پسند تحریک کے تحت، بحیثیت مجموعی اس دور میں موضوعات اور ہیئت دونوں کے تجربوں میں قابل قدر اضافہ ہوا۔اظہار خیال کے لیے نئے نئے اسالیب اور نئے نئے پیمانے اختیار کیے گئے۔ اگر چہ موضوع اور تکنیک میں بغاوت کے جذبے نے ابتدائی دور میں ایک بحرانی کیفیت اختیار کی

اور کہیں کہیں افادیت اور مقصدیت کی کثرت نے فن کے جمالیاتی پہلو کو معدوم کیا، کہیں جنسی مسائل کے ذکر سے عریانی پیدا ہوئی اور کہیں شاعری محض نعرہ بن کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ روایت اور بغاوت کے سبب بنیادی توازن پیدا ہوا اور شاعری کا نیا روپ نکھر کر سامنے آیا۔

اردو شاعری میں واقعہ کربلا کا استعارہ جبر کے خلاف حریت اور آزادی کی فکر کی علامت کے طور پر اقبال نے پیش کیا اور اس بات کا شکوہ کیا کہ قافلہ فرات میں ایک بھی حسین نہیں۔ بعد کے شعراء نے جن میں سردار جعفری ،فیض احمد فیض اور افتخار عارف شامل ہیں انھوں نے بالخصوص اس استعارے کو برتا ہے۔ احمد شمیم بھی گردوپیش میں موجود جبر و بربریت کو کربلا کے استعارے سے انتہائی منفرد انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ متضاد قوتوں میں صلح نہیں ہوسکتی اس کا بالاخر نتیجہ جنگ ہی ہوتا ہے، شمیم لکھتے ہیں:

صلح کی پہلی صف میں کھلائے
ہوئے مردہ جسموں کو دیکھئے
کہے ___ کیا کہے
صلح کی پہلی صف کا ستم جنگ سے سخت ہے
آؤ دیکھیں، انہیں جن کو ادراک تھا
اور جو بے ہنر تھے۔ سبھی کٹ گئے
گرتے لمحوں کی بھیگی ہوئی ریت میں
کس نے خوابوں میں آ کر کہا تھا انہیں
تم نئے لفظ کی سرسراہٹ بنو!
کربلا پاس ہے (گھر کے آنگن میں ہے) پاس ہے

نئی نظم اور احمد شمیم

احمد شمیم اس بدلتی ہوئی ادبی اور فکری فضا سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ایک ذہین انسان تھے جو نئی سوچ ارتقاء کی صورت لے کے آئے اُسے خوش آمدید کہا۔ چنانچہ جب ہم احمد شمیم کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں فوری طور پر ترقی پسندوں کے گروہ کے لوگوں سے ادبی طور پر الگ شناخت کر سکتے ہیں۔ احمد شمیم نے اپنی شاعری میں استعاروں کی بھرمار جاری رکھی ہے۔ اس کی روح پر اس کے فکر اور وجدان پر گردوپیش کے غیر منصفانہ نظام کے استعارے اتنی شدت کے ساتھ اس جبر کو محسوس کرنے کے باوجود مایوس نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ صرف حیات بخش اور حیات افروز نقطہ نظر کا حامل ہے بلکہ ایک روشن مستقبل کے ساتھ اس کی عہد مندی اتنی مستحکم ہے۔ جس میں اس کو اور اس کے قاری کو مایوسیوں کی اتھاہ

گہرائیوں میں گرنے کی بجائے جہد البقاء میں شامل ہونے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وقت کے سیاسی انقلابی رہنماؤں کو انہوں نے ہمیشہ اپنے قریب محسوس کیا۔ ہوچی منہ، لومبا، چے گیویرا، ماؤزے تنگ سے وہ متاثر تھے۔ ان انقلابی لوگوں کا ذکر ان کی نظموں میں ایک تخلیقی بہاؤ کے ساتھ ملتا ہے۔

کون تیار ہے تیاگنے کے لیے راحتیں
ماؤ کے سارے اقوال برحق سہی
کون تیار ہے

(ہوا فاختہ ہے : اجنبی موسم میں ابابیل)

ابھی تو پچھلے پہر کی دستک کا خوف
کمرے میں گونجتا ہے
اداس دہلیز پر لومبا کی سرکٹی لاش
کے حوالے سے ساری صدیوں کو دیکھنا ہے

(مصلوب روشنی کی شہادت: اجنبی موسم میں ابابیل

گیویرا، جواں ہے چے گیویرا
تیرے شہر میں، خون سے آگ ہے
اور آنکھوں سے بہتی ہوئی تیرگی کا سمندر
دکھ جاگتے ہیں، زمیں سوگئی ہے

(ہوا فاختہ ہے: اجنبی موسم میں ابابیل)

عظیم انقلابی راہنما ماؤزے تنگ کی جدوجہد میں "لانگ مارچ" ایک استعارہ بن چکا ہے۔ احمد شمیم (لانگ مارچ) میں پرانے ترقی پسندوں سے الگ لب ولہجہ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سلائیوں میں پرو کے آنکھیں چلو
کہ ہم اپنا عکس ڈھونڈیں
عذاب کی رات لاش بن کر
ہماری دہلیز پر گری ہے!
ہتھیلیوں میں بجھے ہوئے آفتاب کی راکھ میں
ہوا سانس لے رہی ہے
یہی صدا تھی جو سنگِ اول کا زخم بھی تھی
لہو کے عرفان کا ثمر بھی

مٹے ہوئے بے نشان رستوں پہ تہہ بہ تہہ تیرگی کی تحریر

سے عیاں ہے:

کہ ہم نے صدیوں کی خاک ڈالی اس آئینے پر

جو رقص بھی تھا، جمود بھی تھا

مڑے ہوئے ناخنوں سے یک رنگ تختیوں پر

ہماری تاریخ لکھنے والے

ہمیں ہماری ہزیمتوں کی تلاش میں ہیں

ابھی ہماری صدا وہ پتھر نہیں جو رنگوں کی داشتہ ہو

کہ ہم کسی اور کی کہانی کے لفظ بن کر بکھرتے جائیں

☆☆☆☆☆

ابھی ہمارے لہو میں بدبو کی جنگ جاری نہیں ہوئی ہے

کہ ہم کو سنگ سفر نما بھی نہ ہاتھ آئے!

ابھی سیہ جنگلوں میں اگتی ہوئی صلیبوں کے دل میں

اک آرزو جواں ہے

خوش ریوڑ کی زندگی کل کی داستاں ہے

عظیم تر آسماں کے زہراب میں نہالو

سلائیوں میں پرو کے آنکھیں چلو

کہ ہم اپنا عکس ڈھونڈیں!

☆☆☆

یہ نظم زندہ شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ نئی تراکیب اور استعارے قابل غور اور نئے طرز اظہار کی تازگی اور مہک اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا چناؤ اور نشست و برخاست احمد شمیم کو ہجوم سے الگ کر کے اپنی شناخت کا سبب بنتا ہے۔

احمد شمیم ذہین، علمی اور فکری انسان تھے۔ انگریزی اور اردو ادب کے بارے میں ان کا مطالعہ بے پناہ تھا۔ وہ نہ صرف عام گفتگو میں بلکہ ادبی بحث و تمحیص میں بھی اپنی ایک محکم رائے رکھتے تھے۔ اگر احمد شمیم کی شاعری کو ان کی ذات سے علیحدہ کر کے پرکھا جائے تو یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے شاعر کا کلام ہے جس میں روح عصر بولتی ہے اور نظموں میں حالات کا دل دھڑکتا ہے۔ ممتاز حسین اس سے ہٹ کر کہتے ہیں کہ کسی شاعر کے ادبی مقام کو متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ شاعر خود کیا ہے۔

اگر اس حوالے سے بھی دیکھیں تو احمد شمیم بااصول مجاہد دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی محکم رائے رکھتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ فکری مباحث میں پروفیسر سے الجھنے میں گریز نہیں کرتے تھے۔

ایم ۔اے اردو کلاس میں پروفیسر صفی حیدر دانش، منطق، استقرائیہ اور استخراجیہ کی بحث کو یونانی فلسفوں کی توجیہات سے مدلل کرر ہے تھے کہ احمد شمیم اُٹھ کھڑے ہوئے اور بلاجھجک کہنے لگے کہ آپ ہر دو کی اُلٹ تعبیر وتشریح کرر ہے ہیں۔ کلاس روم کی صورت حال پریشان کن ہوگئی اور پروفیسر صاحب کو کلاس چھوڑنی پڑی ___ پروفیسر بخاری کے نزدیک یہ کام اور یہ جرأت ہم میں سے احمد شمیم ہی کرسکتا تھا۔

پروفیسر سرور کامران کا کہنا ہے:

''ایک دن میں اور احمد شمیم نظریۂ اضافت کے تحت حق وصداقت کے بارے میں گمان و یقین کی بحث کرر ہے تھے Paradoxes کی بحث چل نکلی۔ Zeno کے Paradoxes زیرِ بحث آئے ۔ میں نے کہا یہ بحث فلسفے اور ریاضی کی بے کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔ دوسرے دن احمد شمیم سے پھر ملاقات ہوئی ، بحث چل نکلی میں نے Main stream of Mathematics اور برٹرینڈرسل کی A.B.C. of relatively اس کے حوالے کردی۔ جس کا اس نے بھرپور مطالعہ کیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شمیم کی قوتِ مطالعۂ زبردست تھی اور وہ کسی بھی چیز کے بارے میں مزید مطالعۂ سے گریز نہیں کرتے تھے۔ علم کی طلب اور مطالعہ کے شوق نے احمد شمیم کے اندر کے شاعر کو بہت خودآ گاہ بنادیا۔''(۴۵)

احمد شمیم اپنے ایک مضمون (شاعر کا بنیادی سوال) میں لکھتے ہیں:

''ہر شخص کی زندگی کا حاصل صرف ایک سوال ہوتا ہے۔ شعوری طور پر یہی سوال مختلف سمتوں میں سفر کرتا ہے تو کئی آئینوں میں بے شمار صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جلدی یا دیر ہر شخص کو ___ خصوصاً ہر خالق کو ___ اس ایک اہم سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات لاشعور میں اس سوال کا Incubation Period طویل ہوجاتا ہے لیکن اس کے باوجود مختلف مراحل پر یہ سوال اپنے اندرونی تخلیقی کرب کی صورت میں منتشر انداز میں ظاہر ہوتا رہتا ہے اور یہ سارا عمل ___ تمام تخلیقی عمل ایک ہی نقطۂ عروج کی طرف غیر محسوس طور پر بڑھتا رہتا ہے۔ نقطۂ عروج پر وہی ایک سوال واضح اور عریاں شکل میں اُبھرتا ہے یوں تخلیقی سفر کا انجام ہوتا ہے اور فن کار اپنی تکمیل کرتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ اہم

سوال یک لخت ابتدائی مرحلوں میں ہی سامنے آتا ہے اور پھر یہی سوال بکھر کے یا تخلیقی انتشار کی وجہ سے مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے تاوقتیکہ تمام عکس ایک ہی Focal Point پر جمع ہو کر پھر وہی سوال بن جاتے ہیں ___ ایک سوال، ایک اکائی، بلکہ اکائی کے درد کی تجسیم ___ فن کار کی مسلسل تخلیقی تگ و تاز کی یہی دو صورتیں اور سفر کی یہی دو جہتیں ہوتی ہیں اور اس ایک نقطے سے دوسرے نقطے کے سفر تک اس کی فنی حیات عبارت ہے۔

جیسا کہ جمیل ملک کی نظم میں ایک اہم سوال نے جنم لیا:

یہ کائنات اگر تیرے بس کی بات نہیں
تو کائنات بنائی تھی کس لیے تو نے

جس کائنات میں اسے ایک باشعور متحرک ذات کی حیثیت سے پھینک دیا گیا اس میں نراج، انتشار اور فقدان جمال نہ ہو۔ اس اعتبار سے اسے میں اعتدال کا شاعر کہہ سکتا ہوں ۔ اعتدال سے میری مراد وہی ہے جسے قرآن کریم میں تعدیل کے نام سے یاد کیا گیا ہے یعنی Perfection اعتدال کی فنی کائنات میں اس سے بہتر تعبیر اور تعریف نہیں مل سکتی کیونکہ اس تعریف میں اعتدال مصلحت پسندی کے قبح سے مبرا ہو جاتا ہے۔ یہ انہام کا مرحلہ ہے اور انکشاف کی وہ منزل ہے جہاں ذات صرف Recipent رہتی ہے۔ آگہی کا یہ شعور ابھی تک حصار بندی کی وجہ سے بہاؤ کی راہ متعین نہیں کر پایا۔ میں نے شروع میں کہا ہے کہ جن لوگوں پر اپنے اہم سوال کا انکشاف شروع نہیں ہوتا وہ قدم بہ قدم اس سوال کی طرف بڑھتے ہیں ۔ منتشر ذروں میں انہیں اس سوال کی کرچیاں نظر آتی ہیں جنہیں فنی طور پر وہ یکجا کر کے اپنا سوال مکمل صورت میں تراشتے ہیں اور اس کے برعکس جن لوگوں کو اپنا سوال آغاز ہی میں ملتا ہے وہ اُسے ذروں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر ان ذروں کو یکجا کر کے اپنے نقطۂ آغاز کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ اس سفر کو ہم رجعت نہیں بلکہ تکمیل ذات کا سفر کہہ سکتے ہیں اور اپنی ناکامیوں اور وسیع، بے حس، بے جہت کائنات کی حتمی قوت کے احساس کے ساتھ جب ہم اپنی ذات اور اپنے نقطۂ آغاز کی طرف لوٹتے ہیں تو ہم بدھ کا گیان لے کر آتے ہیں۔ بڑ کے درخت کے نیچے نروان کی حالت میں مرنا تکمیل ذات نہیں حصول عرفان ہے۔ تکمیلِ ذات کا مسئلہ

جنگل اور بڑ کے درخت سے لوٹنے اور لنکا سے لوٹنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہیں سے Divine Wisdom کا سورج طلوع ہوتا ہے اور پھر ذات، حسن اور کائنات کے درمیان سوال و جواب کا رشتہ قائم نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کے بھاری پتھر اور پھول کی پتی کو ایک ہی ترازو میں تولتا ہے کیونکہ فنا دونوں کی میزان ہے۔" (۲۶)

اور پھر کہتے ہیں:

"اور اپنا اہم سوال تلاش کرنا ہی ذاتی سطح پر ہر شخص کا عظیم کارنامہ ہوتا ہے کیونکہ اسی سوال کی روشنی میں انسان اپنی ذات کا سفر طے کر لیتا ہے۔" (۲۷)

احمد شمیم کی چند طویل اور مختصر نظموں کا مطالعہ

اجنبی موسم میں ابابیل

احمد شمیم کی پہلی کتاب جو طویل نظموں پر مشتمل ہے۔ شاہد ثاقب اس کتاب پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"میں نے احمد شمیم کو نہیں دیکھا اس کی تصویر دیکھی ہے، تحریر دیکھی ہے، شاید آدمی کو جاننے کے لیے اس سے ملنا ضروری نہیں ہوتا کیونکہ جو کچھ ہم کسی سے مل کر جاننا چاہتے ہیں وہ بات اکثر چھپائی جاتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف چہرہ ہوتا ہے اور چہرے پر مصلحتوں کا نقاب جو اندر کے اصل اور سچے انسان کو چھپائے رکھتا ہے ممکن ہے تصویر بھی کچھ نہ بتا سکے جو تحریر بتا سکتی ہے کیونکہ تحریر وہ طاقت ہے کہ لاکھوں پردوں میں مستور انسان بھی بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر اور ادیب جب کسی تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو روح اور جسم کو الگ الگ نہیں کر سکتے نہ جسم کے مطالبات روح کے تقاضوں سے متصادم ہوتے ہیں بلکہ ایک قسم کی ہم آہنگی ہوتی ہے جو ایک شخص کو مکمل صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

"اجنبی موسم میں ابابیل" میرے سامنے ہے اور اس پر کچھ لکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ اس پر کیا لکھوں۔ کیا اخباری تبصرہ نویسوں کی طرح یہ کہہ دوں کہ یہ

کتاب عکسی پبلشرز نے بڑی محنت سے شائع، جلد اور خوبصورت گردپوش سے مزین ہے لیکن میں یہ سب کچھ نہیں لکھ سکتا کیونکہ یہ سب کچھ وہ ہے جو ہر شخص کو نظر آجاتا ہے۔ میں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جس تجربے سے گزرا ہوں میں تو اس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

احمد شمیم خوش قسمت انسان تھے کہ انہیں ایسے دوست ملے جنہوں نے احمد شمیم کے مرنے کے بعد بھی دوستی کی لاج رکھی۔ یہ ایک دوست کا دوسرے دوست کو خراج تحسین ہے ورنہ آج کے دور میں نفرتوں کے درمیان دوستی جیسے خوب صورت جذبے کی تشکیل جہاد سے کم نہیں ہے۔ "اجنبی موسم میں ابابیل" ایک حساس شاعر کی روداد ہے۔ اس میں احمد شمیم نے طویل نظمیں لکھیں۔ زندگی میں جب سے مادّیت کا غلبہ ہوا ہے، انسان کا انسان سے اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ نے انسان سے اس کا فطری پن چھین لیا ہے۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے موضوع کی وسعت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان نظموں میں کائنات کے زندہ اور متحرک مظاہرے بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کا لہجہ سنجیدہ اور فکر بڑی گہری ہے۔ ان کے ہاں لفظوں کی دو سطحیں ہیں۔ ایک اوپری معنی کی سطح اور دوسری اس سطح کے نیچے کی فکری سطح ہے۔ انہوں نے ان لفظوں میں صرف گہرا فلسفہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ زندگی کے بعض حقائق کو مؤثر انداز میں دلکش اسلوب میں بیان کیا۔

احمد شمیم کے ہاں اظہار کا ایک فطری اسلوب ملتا ہے۔ اجنبی موسم میں ابابیل کی نظمیں، نیم روشن اُجالے کی شاعری نہیں ہے۔ اس میں حسن بھی موجود ہے اور زندگی کے سنجیدہ اور گھمبیر مسائل بھی۔ شاعر اپنے خارج سے جو مشاہدے کرتا ہے اُسے اپنے داخلی تجربات سے ملا کر تخلیقی عمل سے گزارتا ہے۔ 'رات کے آنسو'، 'بانجھ لمحوں میں مناجات'، 'ہمزاد' اپنے فلسفہ کی بناء پر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں مثلاً:

ہوا پکارے گی ہم کو
تو ہم سفر کی سب منزلوں سے گزریں گے سر برہنہ

پرانی مٹی کی باس لے کر چلیں گے
جو رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہی ہے
تمام شہروں کے گدلے پانی میں
جس کی بو بیٹھے بیٹھے ہم کو پکارتی ہے
گئے زمانوں میں تپتی سڑکوں پر ایسے شہروں میں
کیسے شہروں میں ___ کون جانے!(۴۸)

احمد شمیم کی نظموں میں وقت، زخم بے نشاں، مصلوب کی روشنی کی شہادت اور اجنبی موسم میں ابابیل، ایسی نظمیں ہیں جو انسان پر معاشرتی اور معاشی جبر سے اُبھرتی ہیں۔ جب سے انسان طبقات میں منقسم ہوئے ہیں، انسانوں پر انسانوں کے جبر کا یہ سلسلہ اس وقت سے قائم ہے۔ احمد شمیم اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ نظمیں ہمیشہ ہمارے درمیان اس کے وجود کو قائم رکھیں گی۔

اجنبی موسم میں ابابیل میں ایک طویل نظم کا کچھ حصہ:

آؤ پھولوں کی گرتی ہوئی پتیاں
اپنے دامن میں بھر لیں
ہوا تند ہے
سر پر پھیلا ہوا آسماں
ایک بے فصل کھیتی کا نوحہ
ہمارے مقدر میں ہے
راستے میں سسکتی ہوئی چاپ کو
اپنی پلکوں سے چننے کی ساعت گزر جائے گی
چاند کے ہم سفر
نصف شب کو ہماری چھتوں پر
گناہوں کی بارش میں بھیگے ہوئے
بے ہنر انگلیاں بانٹنے آئیں گے

☆

سارے الفاظ میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں
جس کی مٹھی میں تقدیر ہو
اپنے پرچم اُٹھائے ہوئے لوگ بھی اپنی آواز کے منتظر

ایک حیرت کی تصویر ہیں
حکمنائے کے ماتھے پہ الفاظ کا خون ہے
بین کرتی ہوئی بیبیو!
شہر میں ریت ہی ریت ہے
آئینے منظروں سے جدا ہو گئے
ریت کے شہر میں
کانچ کے ٹوٹے گلدان میں پھول ہیں
بند کمرے میں سائے کے پہلو میں لپٹی ہوئی روشنی
آسماں اور زمیں کی طرح تیرا میرا بدن
گرم سانسوں کی رسی میں جکڑا ہو
سارے لفظوں کی حیرت سے آزاد ہے
کون صدیوں، زمانوں، کی بوڑھی امانت اٹھا کر چلے
کون اپنے ہونے کے الفاظ میں
ہونے والوں کو آواز دے
بند کمرے سے باہر ہوا تند ہے
وقت کی فاحشہ
ان جنے واہموں کی اذیت سے مجبور ہے
تازیانوں کے موسم میں جسموں کی حُرمت بڑی بات ہے
کانچ کے ٹوٹے گلدان میں پھول ہیں
شہر میں ریت ہی ریت ہے
آؤ پھولوں سے گرتی ہوئی پتیاں
اپنے دامن میں بھر لیں
ہوا تند ہے!!

اجنبی موسم میں ابابیل

اس نظم کا بنیادی نقطہ ملکی سیاسی صورتحال ہے اور یہ نظم ملک میں ہونے والے ایک بڑے المیے یعنی بھٹو کی موت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
نظم میں جہاں شاعر کہتا ہے

حکمنائے کے ماتھے پہ الفاظ کا خون ہے
بین کرتی ہوئی بیبو!

بڑے واضح انداز میں اس کا اشارہ بھٹو کی پھانسی کی طرف ہے۔ اس نظم پر سن ۱۹۸۰ء درج ہے۔ یوں اس نظم کی مرکزی تحریک بھٹو کی پھانسی سے ملتی ہے
آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں:

"مجھے ایسے لگتا ہے کہ اس نظم کی بنیادی تحریک اسی المیے سے لی گئی ہے کیونکہ اگر پورے پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو یہ ایک بہت تکلیف دہ صورتحال ہے۔
"اجنبی موسم میں ابابیل" پورا عنوان ہی تاریخ کے جبر کی علامت نظر آتا ہے۔ ہر دور میں آزادی پسندوں کے لیے موسم اجنبی رہا اور جس طرح ابابیلیں اجنبی موسم میں ہجرت کر جاتی ہیں اسی طرح آزادی پسندوں کو بھی ہجرت کرنا پڑی۔
اس عنوان کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ابابیل ہمیشہ اپنی پسند کے موسم میں ظاہر ہوتی ہے لیکن اجنبی موسم میں آکے ابابیل نے انسان کی عظمت اور بڑائی کی شہادت دی۔ انفرادی سطح پر اجنبیت کا تجربہ بھی اس میں موجود ہے کہ شاعر اس ماحول میں اجنبی ہے جو زمانی ہے، یا مقامی ہے، اس میں وہ اپنے آپ کو اس ابابیل کی طرح تصور کرتا ہے جو اجنبی موسم میں گھر گئی ہو اور واپسی کے راستے سے بے خبر ہو۔

خواب کے آئینے بجھ گئے!
اور نوٹوں کی پیشانیوں کی چمک اسم اعظم ہوئی

اس آزاد نظم میں بھی احمد شمیم نے نئی نئی علامتیں اور تمثیلیں استعمال کی ہیں۔ ساری نظم میں ایک شاعرانہ آہنگ برقرار رہتا ہے۔
احمد شمیم کی نظموں میں اکثر ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو عموماً شعری زبان میں استعمال نہیں کیے جاتے۔ اس نظم میں ہمیں غیر مانوس الفاظ ملتے ہیں مثلاً بے ہنر انگلیاں، بوڑھی امانت، سگریٹ، کڑوا کسیلا دھواں، کیچڑ، گاہک، جوہڑ وغیرہ۔
یہ نظم ۱۳۲ لائنوں پر مشتمل ہے اور نظم کا آغاز نہایت ہی شگفتہ انداز میں ہوتا ہے۔
"آؤ پھولوں کی گرتی ہوئی پتیاں اپنے دامن میں بھر لیں" (۳۹)

بانجھ لمحوں میں مناجات

"بانجھ لمحوں میں مناجات" احمد شمیم کی ان چند طویل نظموں میں سے ایک ہے جسے پڑھ کر نئی نظم کے فکری، تکنیکی اور اسلوبی امکانات کی وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ احمد شمیم کی اس طویل نظم کا موضوع اس عورت کا المیہ ہے جسے زمانے کے جبر اور معاشرے کے استحصال نے بنجر اور بانجھ بنا دیا۔ یہ عورت زندگی کی قوت نمو کا افضل ترین اظہار اور زندگی کی صدیوں کی تگ و دو کا ثمر ہے۔ یہ آج کی عورت اتنی ہی قدیم ہے جتنی زمین کی زرخیز مٹی۔ یہ عورت زمانے، تاریخ اور معاشرے کے جبر کی زد میں آ کر فاحشہ بن جاتی ہے۔ جسم کی سطح پر ہچکولے کھانے لگتی ہے اور اپنے مرکز سے دور ہٹ جاتی ہے لیکن اس کا وجود اور اک اُسے اپنی اصل سے منقطع نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنی ذات کے جوہر میں رابعہ اور مریم کی طرح مقدس رہتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسا پیکر ہے جسے ہوا، دھوپ، مٹی اور وقت نے فطرت کے کسی مخفی منشا کے تحت تشکیل دیا ہے۔ اس کے بعد شعور کی رو میں ہیلن آف ٹرائے کے المیے سے لے کر آج کے صحافتی کلچر تک پھیلے ہوئے زمانے میں نمو پانے والے اس خواب کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوا اور اس نئی نسل نے ابھی تک جنم نہیں لیا جسے وجود میں لانے کا وعدہ خود زندگی کے مقدر کی اساس ہے۔

یہ نظم ۱۰۷ لائنوں پر مشتمل ہے۔ نظم اپنا آغاز خوبصورت اور عجب قسم کے نامانوس امیجز سے کرتی ہے۔ مختلف تاریخی، مذہبی اور دیومالائی حوالوں اور اچھوتے امیجز کی ایک دنیا لئے ہوئے اپنے منطقی انجام تک پہنچتی ہے اور یہ نظم بالعموم فعلاتن، فعلاتن، فعلاتن کی رواں بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس بحر سے آشنائی ہوتے ہی لاشعوری طور پر ہم ن۔ م راشد کی نظم "دریچے کے قریب" کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

"بانجھ لمحوں میں مناجات"

گفتگو زرد ہوا
دھوپ دہلیز پہ بے چشم بھکارن کی طرح
اک جواں سال کنیز
کالی ڈائن کی طرح، ایک مکمل پیری کی صورت
بند پانی میں ابابیل کا سایہ ___ سایہ
میرا سایہ میری دیوار پہ تحریر ہے جو دل میں!
آ گزر گہ سے پرے، نیلی گپھا میں اُتریں

دھند میں کھوئی ہوئی شکل کو ڈھونڈیں جو نہیں

☆☆

اے گواہی کے نہ بولے ہوئے لفظوں کی سزا

مری منقار سے گر

دانہ، دانہ، نہ بکھر اور بکھر

خواب تعبیر کی زنجیر سے آزاد تو ہو

رابعہ، رابعہ، مریم، مریم

میرے سینے پہ کوئی ہاتھ رکھے

ہونٹ رکھے

کوئی صلیب!

اور میرے ہاتھوں میں کوثر بھی ہے دوزخ بھی ہے!

ہوا فاحشہ ہے

احمد شمیم نے ہوا کو فاحشہ کہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہوا اپنا رخ بدلتی رہتی ہے اور کچھ لوگ ہوا کے رُخ پر چلتے ہیں اور وہ بنیادی طور پر بڑے کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر چہ زندگی ایک خاص Pattern میں اپنا رخ بدلتی ہے لیکن وہ چلتی دائرے میں ہے۔ چنانچہ یہ نظم شخصی، علمی، سیاسی اور بین الاقوامی سطح پر ایک تاثر قائم کرتی ہے۔

پروفیسر سرور کامران کہتے ہیں:

''شاعر نے کئی موضوعات کو بیک وقت ہاتھ میں لے لیا ہے جیسے مختلف رنگوں کے دھاگے اس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ان کو بیک وقت بن رہا ہے۔
اس نظم میں ماؤ ایک Reallity اور symbol کے طور پر سامنے آتا ہے۔
اس نظم میں چی گویرا کا ذکر ہے۔ چی گویرا بھی Struggle کا ایک symbol ہے۔ چی گویرا اور ماؤزے تنگ دو مختلف تکنیکوں کی تیسری دنیا کی struggle ہے۔ احمد شمیم یہ علم رکھتا تھا کہ وہ جدوجہد جو ماؤزے تنگ نے کی اور جو خواب اس نے دیکھا اس خواب کو توڑنے والوں نے بھی اس کے خلاف اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اس طرح شمیم نے دو ایسے Heroes کا ذکر کیا ہے جن کے

درمیان تقریباً ساری دنیا آجاتی ہے۔

ہوا کی آمد ورفت کا نام سانس ہے" ہوا فاحشہ ہے" غالباً احمد شمیم کی مراد یہ ہے کہ یہ جتنے ہیولے چلتے پھرتے ہیں سب سانسوں کے ہیولے ہیں۔ چنانچہ جتنی بدنمائیاں سرزد ہورہی ہیں یہ ہوا کی فاشی کے ذریعے ہورہی ہیں اگر یہ سانسیں درست ہوجائیں تو شاید کاروبار حیات درست ہوجائے۔

اس نظم میں پوری انسانی تاریخ کے کینوس پر دیکھا جائے تو وہ تمام واقعات اور تحریکیں جنہوں نے انسانی زندگی میں تغیر وتبدل پیدا کیا مثلاً ٹرائے کا ذکر، ہیکٹر کی لاش کی بے حرمتی ___ کا ذکر ہے جس کا احمد شمیم پر گہرا اثر ہے۔

ہوا فاحشہ ہے، کتاب کی سب سے طویل نظم ہے، جو ۲۵۰ لائنوں پر مشتمل ہے۔ (۳۰)"

"هوا فاحشه هے"

قد آور تماشے سے اس نے کہا
سارے الزام برحق ہیں ___ لیکن
(ہوا فاحشہ ہے)
پرانی رتوں کے حوالے سے دیکھو مجھے
سب پرندے بہت دور کے ساحلوں کی تمنا میں
پر کھو چکے ہیں
جواں زرد پتوں کو چھوتی ہوئی
گنگناتی ہوا فاحشہ ہے
ہری دھوپ بیوہ ہوئی ہے
زمیں زلزلے کی انا اپنے پہلو میں لے کر اُٹھے گی
تو ہم کیا کہیں گے
زمیں اَن جنی فصل کے بوجھ سے چُور ہے
تو جواں ہے گیو یرا، تمہاری زمیں چُور ہے
اور آنکھوں سے بہتی ہوئی تیرگی کا سمندر
مرے ساتھ، مجھ سے پرے، پھیلتا جارہا ہے۔

سارے گرجوں کی خوشبو ہے
(مریم ترالاڈلا)
جس کے ماتھے پہ، بالوں میں، کپڑوں میں
معصومیت کے سفر کی سزا، گرد
شہروں کی، دیہات کی
اور ہاتھوں میں کیلیں گڑی
___ اور دہشت زدہ آدمی
جو گناہوں کا ضامن نہیں
اب کسی کے گناہوں کا ضامن نہیں
موسموں کے تشکر کا مارا ہوا
لاوالا کی سرحد پہ بیٹھا ہوا

"ریت پر سفر کا لمحہ"

"کبھی ہم خوبصورت تھے" میں سب سے پہلے اس نظم کے بارے میں یہ بتانا چاہوں گی کہ اس نظم کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ ۱۹۷۹ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن شمیم آفس سے جب گھر واپس آئے تو آتے ہی بولے "منیرہ! ہم تو بوڑھے ہو گئے بھئی"۔

میں نے پوچھا وہ کیسے؟

بولے میں آج آفس سے واپسی پر ٹیکسی نہ ملنے پر بس میں سوار ہو گیا۔ ابھی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک لڑکی آئی اور بولی: بابا جی! تھوڑی جگہ دیں گے ___ میرے اوپر جیسے بجلی کوند گئی، کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟

خود سے سوال کیا ___ اور ساتھ ہی نظم کا ایک مصرعہ ذہن میں بن گیا۔

میں نے پوچھا کیا ___ تو بولے۔ "کبھی ہم خوبصورت تھے"

شام تک یہ نظم کاغذ کی زینت بن چکی تھی۔

ایک شام یونس منصور جوئی۔ وی نیوز میں تھے اور شمیم کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ وہ ہمارے ہاں آئے اور شمیم سے کہا مجھے تمہاری دو تین نظمیں چاہئیں، ٹی وی کے لیے۔ شمیم پوچھنے لگے ___ گائے گا کون؟

یونس بولے نور جہاں سے گواتے ہیں۔
شمیم بولے ___ نہیں ___ یونس نے کہا ___ چلو ایک نئی لڑکی نیرہ نور ہے اس کی آواز بہت اچھی ہے، اس کو دیتے ہیں۔ شمیم نے دو تین نظمیں یونس منصور کو دے دیں جن میں یہ نظم بھی شامل تھی۔ اس طرح نیرہ نور کی آواز میں گائی جانی والی نظم احمد شمیم کی پہچان بن گئی۔
اور پھر احمد شمیم کی یہ نظم "کبھی ہم خوبصورت تھے" ٹی وی کے ایک ڈرامے "تیسرا کنارہ" میں بھی شامل کی گئی۔
اس نظم میں ایک خاص، تازگی، خوشبو، مہک اور پاکیزگی کا تاثر ہے۔ اس میں بچوں کی سی معصومیت ہے۔ اس نظم نے جہاں احمد شمیم کو روشناس کروایا وہاں اس نظم کی وجہ سے اس کی شاعری کسی حد تک محدود بھی ہوئی۔
آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں:

"احمد شمیم اس نظم کو ایک عام سی نظم سمجھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اس میں اس کا روحانی تجربہ موجود نہیں۔ اس نظم میں احمد شمیم کی مخصوص Intellectual Depth کی بجائے جذباتیت کا دباؤ زیادہ نظر آتا ہے جبکہ عام طور پر احمد شمیم کی نظمیں فلسفیانہ گہرائی کی حامل ہوتی ہیں۔ منطقی اعتبار سے یہ نظم ایک ربط میں ہے۔ اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نظر نہیں آتا۔ تمام لائنیں سمجھ میں آنے والی ہیں۔ بہت قابل فہم اور آسان نظم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد شمیم نے اس نظم کا عنوان "ریت پر سفر کا لمحہ" کیوں رکھا۔ شاید اس پر یہ چند لمحے محض ایک نقش اور Sand of Time کے طور پر ظاہر ہوئے۔ آخری لائنوں میں احمد شمیم کی زندگی کی حسرتیں اور اپنی خواہشات اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ کہتے ہیں:

تو ہم کہتے تھے ___ امی!
تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے

حواس کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کا جدید طرز احساس احمد شمیم کے ہاں نمایاں ہے۔ رنگوں کے جگنو اور روشنی کی تتلیاں کہہ کر وہ اسی طرز احساس کا اظہار کرتا ہے احمد شمیم ایک Intellectual آدمی تھا۔ اس لیے وہ اس قسم کی نظم لکھتے ہوئے بھی آخری لائنوں میں اپنی زندگی کی جدوجہد نئے وقت اور جدائی کے اس

احساس کی وجہ سے ''ماں'' کا حوالہ شاعری میں بار بار آتا ہے۔ ''ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو'' اس میں ماں کی دوری کی حسرت دل میں چھپی ہے اور ماں کا تصور ایک خاص اہمیت لئے ہوئے ہے۔ اپنی حقیقی ماں سے دوری، دوسرے اپنی دھرتی ماں سے بھی دوری اور جدائی کا احساس ملتا ہے۔

کبھی ہم خوبصورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی
بہت سے اَن کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دور تھے
لیکن ہمارے پاس رہتے تھے
نئے دن کی مسافت
جب کرن کے ساتھ آنگن میں اترتی تھی
تو ہم کہتے تھے ___ ''امّی''
تتلیوں کے پَر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو! (۳۱)

(ریت پر سفر کا لمحہ)

احمد شمیم کی غزل

شاعر__ صرف شاعر نہیں ہوتا وہ انسان بھی ہوتا ہے اس کے دل میں بھی وہی خواہشیں اور سوچیں ہوتی ہیں جو ایک عام آدمی کے دل میں ہوتی ہیں اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ وہ جو ایک شاعر اپنی نظم یا غزل میں کہتا ہے وہی بات عام انسان بھی محسوس کرتا ہے لیکن اس کے انداز بیان میں فرق ہے۔

لیکن کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک شاعر یا فنکار انتہا پسند بھی ہوتا ہے۔ روزانہ جو واقعات زندگی میں رونما ہوتے ہیں وہی نقوش اس کے پس منظر میں اُجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً درد، کرب ناک لمحے، خوشی، غم دکھ، موجودہ لمحے کا درد، گذرا وقت __

غرض وہ ہر لمحہ سوچتا نہیں بلکہ اپنے اوپر گزارتا ہے، اس کے اپنے اندر ایک علیحدہ دنیا ہوتی ہے اور وہ اپنے فن کے ذریعے اسی دنیا کی تعمیر کرتا ہے اور یہ اندرونی دنیا باہر کی دنیا سے بڑی مختلف ہوتی ہے۔ ان دو دنیاؤں کے ٹکراؤ میں وہ کبھی دکھی ہو جاتا ہے اور کبھی انتہائی کرب ناک لمحوں میں نجات کی تمنا بھی کرتا ہے۔ ہنسی کی بنیاد، اشکوں پر اور کی بنیاد فریاد پر نظر آتی ہے۔ اسی مقام پر پھر انسان کہتا ہے:

قید و حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

میرے نزدیک ایک فنکار یا شاعر ایک بڑے دکھ کی تلاش میں رہتا ہے۔ کبھی وہ دوسرے کی ذات کے لیے اپنے تمام احساسات، خواہشات، روحانی اور جسمانی مطالبات سے دانستہ غفلت برتتا ہے__ اور کبھی وہ اپنی ذات فراموش کر کے دوسرے کی ذات میں فنا ہو جانا چاہتا ہے۔ یہ ایک زبردست آنکھ مچولی ہے جو فنکار یا شاعر اپنے ساتھ، کائنات کے ساتھ، خدا کے ساتھ، محبوب کے ساتھ اور قوت حیات کے ساتھ زندگی اور موت کا کھیل کھیلتا ہے۔ جس طرح آنکھ مچولی میں تمام لوگ ایک مقررہ جگہ پر بار بار لوٹ آتے ہیں اسی طرح فنکار بھی اپنے مرکزی مقام کی طرف لوٹ آتا ہے اور یہ مرکزی مقام اس کی شاعری بھی ہے اور محبت بھی۔ اگر شاعر کا مرکزی مقام نہ ہو تو وہ بھٹک جاتا ہے۔ اس کے فن میں اور نظم و ضبط میں ترتیب نہیں رہے گی، وہ الجھاؤ بن جائے گا۔

یہ مرکزی مقام اس کے لیے ایک ایسا جذبہ بن جاتا ہے جس کی لگن میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور شعر کہتا ہے۔

شمیم کی غزل میں جدید غزل کے رجحانات بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔ ان کی غزل میں تصوف اور فلسفہ میں حسن و عشق کی شاعری اور زندگی کی شاعری میں پرانی انفرادیت کی جگہ نئی انفرادیت نظر آتی ہے۔ احمد شمیم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہی۔ زندگی کے جن واقعات، حادثات، خوشیاں، غم کے احساسات و تجربات سے گزرے۔ وہ شاعری ان کے تجربے کا اظہار ہی۔

احمد شمیم کی غزل میں قوتِ ارادی کے ساتھ جذبات کا ایک حیرت انگیز اتحاد دکھائی دیتا ہے۔

احمد شمیم ۱۹۴۸ء میں جب پاکستان آئے تو انہوں نے سوچا پاکستان کا سفر کامیابی کے راستے کا پڑاؤ ثابت ہوگا۔ بہت سے دوسرے محبِ وطن رکھنے والوں کی طرح انہوں نے بھی پاکستان کے ساتھ اچھی اُمیدیں وابستہ کی تھیں لیکن شب و روز کی جدوجہد، سفر کے مصائب، اپنوں کی جدائی اور زر و مال کی قربانیوں کے بعد پاکستان آ کر انہیں احساس ہوا کہ ملک کی باگ ڈور مفاد پرست طبقے کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ محبِ وطن عوام اور دانش ور طبقے کے آزادی سے وابستہ خوابوں کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہوگیا اور جب فیض نے کہا:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تو اس کے پیچھے وہی ریزہ ریزہ خواب سسکتے نظر آتے ہیں۔ احمد شمیم کو بھی شدت سے اپنے خوابوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا احساس ہے۔

جانے کیا ہوگیا ہے رنگِ چمن
زخم ہیں شاخ شاخ پہ لوگو!

☆

یاد زنجیر بن گئی جن کی
وہ کہاں جائیں بھاگ کر لوگو!

☆

ہم پہ جس شہر میں اُتری تھی رفاقت کی خزاں
دل اسی شہر ستمگر میں بکھرنا چاہے

☆

شمیم کو شدت سے احساس تھا کہ اس خطۂ ارضی پر جسے الگ وطن کی حیثیت سے حاصل کیا گیا ہے،

ایک فلاحی معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آ سکا۔ غریب کا غریب تر اور امیر کا امیر تر ہوتے جانا اس پر مارشل لاء، انتخابی دھاندلیاں، سماجی برائیاں، جنگیں، عوام کو معاشی تحفظ فراہم نہ ہونا۔ ان حالات نے شمیم جیسے حساس شاعر کے ذہن کو بہت متاثر کیا اور وہ کہہ اُٹھے کہ:

ہنستے لمحوں کی وہ پریاں کس نگری میں رہتی ہیں
جن کی کھوج میں غم کے مارے شہر الم تک آئے ہیں

دیکھو ہمیں کہ طنز ہیں فصلِ بہار پر
دامن ہے چاک چاک نہ زنجیر پاؤں میں

شمیم نے دیکھا کہ ایک وطن پرست شہری کی حیثیت سے جو قربانیاں اس خطہ ارض پاکستان کے حصول کی خاطر عام آدمی نے دی تھیں وہ سب کی سب رائیگاں گئیں اور آئے دن بدلتے ہوئے سیاسی ڈھانچوں نے ملک کی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے کوئی بھی حساس شہری اس گردش حالات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ہر اک گام پہ شام کے سائے دام بچھائے بیٹھے ہیں
کن طوروں دل کو سمجھائیں اپنے وطن کی بات نہیں

کیسی رُت بدلی ہے یارو کوئی من کی بات نہیں
شعلہ تن کی، سرو سمن کی، کنج چمن کی بات نہیں

پت جھڑ کا یہ موسم بدلے، جانے کب سے آس میں ہوں
پیڑوں کو پہنائے کوئی ہریالی کی چادر بھی

شمیم کو یہ احساس بڑی شدت سے رہا کہ ہم سب جس راہ پر چل رہے ہیں یہ حقیقی آزادی کی راہ نہیں چونکہ آزادی کی راہ لہو کی راہ ہے جس پر چلنے سے ہم سب گریزاں ہیں۔ ہمارے الفاظ عمل سے تہی ہونے کی وجہ سے کھوکھلے اور بے معنی ہیں۔

لفظ معنی سے تہی اور عبارت جھوٹی
جیسے صحراؤں میں نقشِ کفِ پا کی صورت

یہ دیس جب انہیں اپنے خوابوں کا دیس نظر نہیں آیا تو وہ کہہ اُٹھے:

ہر انسان پتھر جیسے ہر اک نگر صحرا جیسے
گویا میں نے بھول میں اپنایا ہو یہ رستہ جیسے

پھر ایک جگہ کہتے ہیں:

دھوپ آنگن میں اُتر آئی سفر یاد آ گیا
ہم ابھی دلیز پر ہی تھے کہ گھر یاد آ گیا

جب ہواؤں میں نئی رُت کی ہری چادر کھلی
خود جسے کاٹا تھا ہم نے وہ شجر یاد آ گیا

ہم جو چہرہ لے کے نکلے تھے یہ وہ چہرہ نہیں
آئینے میں آج کیا دیکھا کہ گھر یاد آ گیا

بیکراں قلزم کو چھوڑ آئے تو آگے ریت تھی
دھوپ کی وحشت کو دیکھا تو بھنور یاد آ گیا

پیڑ خالی دیکھ کر موسم سے ڈر آنے لگا
لفظ خالی دیکھ کر اپنا ہنر یاد آ گیا

اب آہستہ آہستہ طویل کشمکش کے بعد ان پر حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ جس فضا میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ بانجھ ہو چکی ہے۔ یہاں صرف نفرتوں، تعصبات اور چھوٹے چھوٹے مفادات کی فصل ہی کاشت ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی فصل کو بارآور کرنے کے لیے یہ دھرتی بنجر ہو چکی ہے۔ اپنی دھرتی کے بنجر پن کا یہ احساس انہیں عدم تحفظ دکھائی دیتا تھا۔

خلاؤں میں بھٹکنے کے اس احساس نے ان کے اندر اپنی دھرتی سے بچھڑنے کا کرب بہت گہرا کر دیا تھا۔ اپنی سرزمین کے دو ٹکڑے میں بانٹ جانے، دوستوں اور عزیزوں سے بچھڑ جانے کا المیہ ان کی شاعری میں بار بار اپنی چھب دکھانے لگتا ہے۔

تیس برس سے ہجر کی چادر اوڑھے ایک سفر میں ہوں
چار قدم کا رستہ طے ہو تو آئے میرا گھر بھی __ !

خواب سا دیکھا تھا اک ترچھی چھتوں کے شہر میں
اب تو ہر اک روز ہی وہ خواب تڑپائے ہمیں

دیکھا ہے زندگی کو کتابوں کی اوٹ سے
یہ سعی بے ثمر ہمیں دیوانہ پن لگے

بستی سے دور ہی سہی، بارش ہوئی تو ہے
بھیگا ہوا ہمیں بھی ہوا کا بدن لگے

شمیم ایک محبِ وطن کشمیری تھے۔ کشمیر کی محبت ان کی روئیں روئیں میں سمائی ہوئی تھی اور اپنی دھرتی سے دوری کا احساس ہمہ وقت ان کے اندر موجود رہتا تھا۔ کشمیر سے محبت اور دوری کا اظہار ان کی شاعری میں اکثر ملتا ہے جہاں وہ اپنی دھرتی ماتا کا ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی غزل میں بھی ___ دلکشی اور ترنم بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ان کی یہ غزل:

ہم نادار نہیں ہیں ہم کو حُبِ وطن جاگیر بہت
حُب وطن دو لفظ مگر ان لفظوں کی تفسیر بہت

اور بھی ہوں گے ملک بہت سے ہرے بھرے کھیتوں والے
لیکن اس مٹی کی خوشبو پاؤں کو زنجیر بہت

دل چاہے ان دیکھے خوابوں کی نگری بھی دیکھ آئیں
خواب بھی اپنی اور نگاہیں خوف بھی دامن گیر بہت

کیا کیا مست صنوبر چہرے من کے جھروکے میں آئے
لیکن ان شکلوں میں بھائے ہم کو اک تصویر بہت

جب ست رنگی آوازوں کی برکھا برسے بستی پر
سارے زخم ہرے ہوجائیں یاد آئے کشمیر بہت

بڑی شاعری اور بڑے شاعر کے لیے وقت زندگی کے ساتھ رواں اور متحرک رہتا ہے، کہیں ٹھہرتا نہیں، اسی لیے شمیم کی شاعری میں ماضی سے حال تک کے سفر کا ایک ایک واقعہ محفوظ ہے جس میں زخموں کی کسک بھی ہے، خوشبوؤں کے بکھیرنے اور کلیوں کے چٹکنے کی صدا بھی ہے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں:

کس نے پھول کو بَن میں دیکھا، کس نے دیکھا چاند
ہم دونوں اک ساتھ ہی ڈوبے میں اور میرا چاند

شہر میں خالی دیواروں پر کس کا نام لکھیں
کس کی سانسوں میں خوشبو ہے کس کا چہرہ چاند

دھرتی پر خوشبو، پروا اور صبح کی میٹھی نیند
امبر پر وہ نور کا دھارا سورج تارا چاند

دائمی شاعری میں جذبے کے خلوص اور فن کی گہرائی کے ساتھ جو بات سب سے اہم ہے وہ زندگی کا احاطہ کرنے کی قدرت ہے جو کسی شاعر کے شعر میں نظر آتی ہے تو وہ نہ صرف اس کے وجود کے متعلق

فیصلہ کردیتی ہے بلکہ ہمیں زندگی کے وہ خدوخال دکھاتی ہے جو شاید ہماری نظر سے پوشیدہ تھے۔ یا ہم نے محسوس نہیں کئے تھے۔ جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ احمد شمیم کا شاعرانہ ادراک جس طرح زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور جس طرح ہماری نگاہ کو نادیدہ مناظر پر متوجہ کرتا ہے اس سے ان کی شاعری میں آدمی کی مرتبہ شناسی اور احترام کا پہلو اُبھرتا ہے۔ وہ عظمتِ آدم کے قائل تھے۔

اس کی عظمت کا جہاں کو پاس ہے
جس کو پاس عظمت آدم رہا !

شمیم کی نظر میں انسان کا منصب وفا کے رستے پر چلتے رہنا ہے یہی ان کے نزدیک جوہر انسانیت ہے۔ اس کے ذریعے شوق میں پہنائیاں پیدا ہوتی ہیں اور جتنی شوق میں پہنائی ہے اتنی ہی انسانیت میں وسعت ہوتی ہے۔ خواہ وہ گلزار خلیل ہو یا گالیاں کھا کر دعائیں دینے کا جذبہ ہو یا مصلوب ہو جانے کا منصب ہو، سقراط کا زہر کا پیالہ ہو کہ امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ، شمیم کے نزدیک یہ سب وفا کے راستہ پر چلنے والے لوگ تھے جن کی نظروں میں منزل بھی تھی اور راستہ بھی اور اس کا انجام بھی ___ وہ اپنے عہد کے انسانوں کو اسی راستے پر گامزن دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کی غزل کے دو مصرعے:

گھر سے نکلو تو اپنے علم بھی ساتھ رکھو
علم بھی ساتھ رکھو، کربلا بھی آئے گا

مجھے یہ شہر لگے دشتِ کربلا کی طرح
یہیں پہ لٹنے کوئی قافلہ بھی آئے گا

شمیم زندگی میں انقلاب کی ضرورت اور قانون کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انقلاب زمانہ کسی کا خرام ناز ہے کسی کی نگاہ سے اُسے نسبت ہے۔ گردشیں مزاج عشق سے ٹکراتی ہیں اور پھر مزاج گردش دوراں بدل جاتا ہے۔ جب وقت بدل جاتا ہے تو آدمی بھی بدل جاتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں انقلاب ڈھلتا ہے جب تک کسی کمزور سے نہ ٹکرایا جائے اس وقت تک آگ اور گلستان کا اور دست گدا اتنا دراز ہو کہ شاہ کے سر سے تاج اُتار دے۔ شمیم نے بھی انقلاب کے لیے دعائیں مانگیں۔

جلا کے راکھ کیا جس نے لالہ زاروں کو
قدم قدم پہ وہی آگ شعلہ زن ہے ابھی

قرار زیست، بہار نظر ، نگار چمن
چلے بھی آؤ کہ افسردہ انجمن ہے ابھی

کہیں سے لاؤ بھی وہ عہد نو کا مہر منیر
کہ صبح اوڑھے ہوئے رات کا کفن ہے ابھی

ان کی نظر نے دیکھا کہ بہار تو لالہ زار نے تمام خاروخس کا خون چوس لیا، پھول کھلے تو آشیانوں کو آگ لگ گئی۔ چمن آرائی کا کام گلچیں کے سپرد ہو گیا۔ قلزم مصائب کیوں کر عبور ہو۔

سکوت مرگ ہے طاری افق سے تا بہ اُفق
غم حیات کا اے دل وہی چلن ہے ابھی

احمد شمیم کی شاعری میں روایتی مضامین بھی موجود ہیں۔ ان کے ہاں غزل میں سادگی و سلاست کے ساتھ دل کی وہ کیفیت بھی موجود ہے جس کو محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شمیم کی ایسی غزلیں تغزل سے بھرپور ہیں۔

تو آئے تو تجھ کو دکھائیں یہ ویراں ویراں لمحے
دل کو کیسے تڑپاتے ہیں گیت میں کیسے ڈھلتے ہیں

سرد، ویراں، رات کے پہلو میں جب جاگا ہے درد
چاند کے محمل میں دیکھی ہیں دل آرا صورتیں

بسی ہے یاد میں اک زخم بے نشاں بن کر
وہ رنگ و نور کی مورت وہ کامنی صورت

نظر میں تیر گیا سیل غم زمانے کا
کبھی جو یاد ہمیں آگئی تیری صورت

عشق و محبت کے موضوعات ہماری اردو غزل میں اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ احمد شمیم کی غزل کے مطالعہ سے ہمیں ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن میں وہ غم جاناں کے شکار ہیں۔

میں پورب تو پچھم جیسے، چاند چکور کی پریت
پیار کا پھل ہے انت جدائی، جنم جنم کی ریت

مہ آئینہ رو، اگر دل زدوں کا یہ مقسوم ٹھہرا تو یونہی سہی
سلگتے ہوئے چاند سے تیری باتیں کریں اور دل کو جلایا کریں

خلیل الرحمٰن "جدید تر غزل" کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگر ہم جدید تر غزل میں صرف ان جذبات و محسوسات کو دیکھنے کی کوشش کریں جن کا تعلق عشق و محبت سے ہے تو ہمیں نئے شاعر کا رویہ خاصا بدلا ہوا نظر آئے گا۔ زندگی میں عشق کی مرکزیت اور اوّلیت کی

روایت سے انکار کی روایت تو ہمیں غالب کے یہاں ملتی ہے اور یگانہ اور فراق نے بھی اس تصور پر خاصی ضرب لگائی ہے لیکن جدید تر غزل میں یہ تصور اور بھی عیاں ہو گیا ہے اور زندگی کے لاتعداد مسائل میں یہ نقطہ کبھی تو نظر آتا ہے اور کبھی خود شاعر کو اس کے موہوم ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کسی زمانے میں فراق کی غزل میں یہ کیفیت دیکھ کر کہ یہاں محبوب ظالم اور جفا کار ہونے کے بجائے وفا شعار ہے اور ہجر کے صدمے صرف عاشق کے حصے میں نہیں آئے ہیں بلکہ محبوب کو بھی اس کے لیے خاک بسر ہونا پڑتا ہے۔ جعفر علی خان نے اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ تو سراسر آداب شاعری اور آدابِ غزل کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں جدید تر غزل کے بارے میں مرحوم کا کیا تاثر ہوتا جہاں عاشق اور محبوب دونوں ایسی کیفیتوں سے دوچار ہیں جہاں آدابِ عشق اور آدابِ غزل دونوں آدابِ زندگی کے سامنے مات کھا گئے ہیں۔

احمد شمیم کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جہاں غمِ جاناں، غمِ دوراں میں گھلتا ملتا نظر آتا ہے۔

دل میں یوں بس گیا غمِ دنیا
تیرا غم اجنبی سا لگتا ہے

☆

نظر میں تیر گیا سیل غم زمانے کا
کبھی جو یاد ہمیں آ گئی تیری صورت

یہاں ہمیں شمیم کی آواز فیض کی آواز سے مشابہ نظر آتی ہے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اور فیض کہتے ہیں:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

احمد شمیم نے غزل میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ سیاسی، اخلاقی، معاشی ہر قسم کے مضامین کو شامل کیا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں بھی دوسرے شعراء کی طرح محبت اور غم محبت کا ذکر ایک جگہ نہیں ہے، فرق یہ نظر آتا ہے کہ شمیم کے یہاں یہ جذبہ صرف محبوب تک محدود نہیں بلکہ بھائی، بہن، ماں باپ، شریک حیات، عزیز دوست، قوم و وطن، ملت و مذہب، ماضی حال، مقصود و مسلک سب کا غم اور سب کی محبت اس میں سمٹ آئی ہے ان کی غزلوں میں عشق و غم، عشق کا بیان اوروں کی طرح محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی رنگ اختیار کر گیا ہے۔

میرا ہر اک خواب ہے تعبیر کی زنجیر میں
اے غمِ دوراں، تیری زد میں میرا ہر خواب ہے

کچھ تمہارا کچھ جہاں کا غم رہا
ہم رہے جب تک یہی عالم رہا

میری آنکھوں سے مگر رونق بازار نہ دیکھ
شہر ویراں نظر آئے گا تجھے گھر کی طرح (۳۲)

شمیم کی غزل میں ہمیں ان کے ذاتی حالات اور ان کی یادوں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ یہ یادیں شمیم کا سرمایہ حیات ہیں۔ ان کی یادوں میں "سنگدل، گل روکمن۔۔ صورتیں بھی ہیں اور تتلی کے رنگین پر بھی۔ ان کی دھرتی خوشبو، پروا بھی ہیں اور "چندا، بہار، چنار، دریا کا نیلا پانی بھی۔ ان کی چند غزلوں کے اشعار پیش ہیں:

کتنی یادوں کی چتا بن کے سُلگ اُٹھتی ہے شام
آگ جیسے ڈوبتے دن کی ہوا ہو دوستو

☆

کچھ یاد ابھی تک ہے اجڑا ہوا آنگن بھی
کچھ پیار مجھے اب بھی تتلی کے پروں سے ہے

☆

سونے سونے من میں مہکے تیری یاد کے پھول
اندھیارے میں جاگا چاند کی کرنوں کا سنگیت

☆

رات آئی ہے، تیری یاد کا جلتا دریا اُمڈا ہے!
دل کی قسمت جاگ اُٹھی ہے دل دن بھر کا پیاسا ہے

☆

پانی کی خوشبو سب گزرے موسم یاد دلاتی ہے
میرے بچھڑے گھر کو چھو کر آیا ہو جیسے

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"ادب میں جب بھی تخلیقی سرگرمی کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ہمیشہ گہری، اصلی اور سچی تخلیق سے ہوتی ہے۔ ایک باصلاحیت انسان کے لیے بھی

سچے اور زندہ خیالات کا حصول کوئی ذہنی کھیل نہیں ہے۔اسی لیے جب تک زندہ خیال کا نظام اپنے پورے مربوط رشتوں کے ساتھ تنقیدی عمل کے ذریعے وجود میں نہ آئے تو تخلیق اندھیرے میں گم رہتی ہے۔

زندہ خیال کو مربوط رشتوں کے ساتھ تنقیدی عمل کے ذریعے وہی فنکار وجود میں لاسکتا ہے جس نے خیال کے پورے نظام کے خطوط پر خود سفر کیا ہو۔"(۳۳)

اور شمیم ایک جگہ لکھتے ہیں:

"لاشعور کے غلبے کے باوصف شعوری اہداف تک رسائی کے لیے فنکار مختلف انداز میں اظہار کا سفر طے کرتا ہے اور مختلف سمتوں اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد وہ خود کو سمیٹتا ہوا اپنے Focal point تک رسائی حاصل کر لیتا ہے یا لاشعور کی ستیزہ کاری اس کے منتشر اظہار خیال کو اپنے سوال یا ہدف تک ایک فطری عمل میں لے کر چلتی رہتی ہے تا آنکہ وہ ایک سوال یا اکائی تک رسائی پالیتا ہے۔شاعر کا تخلیقی عمل سے گزرنا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔بلوغت کا یہ عمل خیال کی بلوغت بھی ہو سکتی ہے اور اس نصب العین کی بھی جو شاعر کے باطن میں اظہار کی قوتوں کو جنم دینے کے اسباب پیدا کرتا ہے اور یہ اسباب شاعری کے مسبب ہیں یا مقصد و ہدف کا جو ہر شخص اور خاص طور پر شاعر کے سامنے ہوتا ہے ۔ذہن انسانی قرطاس ابیض کی طرح ہوتا ہے جس پر وقت اپنی رفتار رقم کرتا ہے یہ مرقوم عبارتیں شعور سے لاشعور کی اور سفر کرتی رہتی ہیں۔

لیکن تاریخ بننے کے لیے رفتار زمانہ کی شدتوں اور حدتوں کی توانائیاں اسے اجتماعی لاشعور کا حصہ بنانے اور اسے آرکی ٹائپ کی شکل دینے میں سیر یاب ہوتی ہیں۔دوسری صورت میں لاشعور یا تو اُسے سرد خانے میں ڈال دیتا ہے یا پھر شعور کو لوٹا دیتا ہے اور شاعر اُسے تجربہ بنا کر شعر کی شکل دیتا ہے مگر شعور کی اسی ستیزہ کاری میں ایک بات واضح ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ شاعرانہ تنظیم ہے۔شاعری کا جواز اس کے معانی میں نہیں اس کی تنظیم سے پیوست ہے کہ تنظیم ہی شاعری کو اس ارفع قرینے سے آشنا کرتی ہے جو خیال کی رفعت اور فن کی راہ ہموار کر کے شاعر کو آنے والے زمانوں تک پھیلاتی چلی جاتی ہے لیکن کس شاعری کو دوام ہے تو اس کا جواب بڑا واضح ہے کہ اس شاعری کو جو انسانی زندگی میں پیوست ہو۔

فیض احمد فیض اور جوش کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں کہ شاعرانہ خلوص کا واحد امتحان شعر کی کامیابی ہے۔"(۳۴)

شمیم کے ان خیالات اور سوچوں کے ساتھ ان کے ہر شعر میں زندہ خیالات کی مہتابیاں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہر ایک اپنی سزا کاٹنے کو زندہ ہے
ہر اک پھول کی تقدیر میں بکھرنا ہے

☆

کتاب میں جو لکھا تھا وہی غلط نکلا
کتاب ہی پہ مگر اعتبار کرتا ہے

شمیم زمانے کے شاعر ہیں۔ انہوں نے آج کی آلودہ اور گھمبیر حقیقتوں سے براہ راست آنکھ ملائی ہے لیکن ارض وطن سے ان کی وابستگی نے ان کے ذہنی اور فکری رویے کو مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ احمد شمیم اپنے اندر بھڑکتے جہنم کی آگ تیز ہونے پر ذہنی طور پر زیادہ موت کے قریب ہو جاتا ہے۔" (۳۵)

جیسے کہ ان کی چند غزلوں کے اشعار:

ہم کو بھی موت کی سزا دینا
ہم نے بھی زندگی کو چاہا ہے

☆

ہم گئے موسم کے بے منزل سفر کی گرد ہیں
کوئی رُت آئے تو اپنے ساتھ لے جائے ہمیں

☆

سانس کے دھاگے میں دن رات کہاں تک باندھیں
اب تو لگتا ہے کہ یہ ہار بکھرنا چاہے!

احمد شمیم کی شاعری کئی جہتوں میں سفر کرتی ہے انسان دوستی، وطن پرستی، اخلاقی اقدار کی پاسداری، طبقاتی تضادات کے شعور سے آراستہ ہے اور اس کے علاوہ ان کی شاعری مضبوط ا تنگ انتظار بھی ہے اور یادگی ہے۔ چند علامتیں ان کے یہاں بڑی خوبصورت اور برمحل معلوم ہوتی ہیں مثلاً چاند، ہمارے کلاسیکی شعراء کے یہاں محبوب یا اس کے حسن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ انتظار میں وہ تلاش و جستجو کے جس عمل سے گزرتے ہیں اس کے منظرنامے پر حقائق کی تلخ کلامی بھی ہے اور گداختگی وانبساط کی ترسیل بھی۔

وہ چراغ کوئے قاتل میں جلا ہوں ساتھ جس کے
شب انتظار اکثر میرے ساتھ جاگتا ہے!

تجھ بن اس اندھیارے جگ میں کیسے عمر بتائیں
یہ چندا آکاش کا راہی چار گھڑی کا میت!

☆

رات کی گود میں سہما ہوا چاند
کب سے فریاد کناں ہے یارو

☆

چاند ابھرے کہ ستارہ چمکے
دل پہ ہر بات گراں ہے یارو

☆

اسی طرح ''خواب'' بھی شمیم کی غزل میں وسیع معنویت کا حامل ہے۔

بے خواب جئیں تو آوارہ اور خواب سے رشتہ سولی کا
ہر اُلجھن اپنی اُلجھن ہے، ہر مشکل اپنی مشکل ہے

بہت پھرے ہیں پہن کر لباس خوابوں کا
تمام عمر رہے دشت میں ہوا کی طرح

میٹھی دھوپ میں نہلائے دن تصویروں میں قید ہوئے
خواب کتاب شباب کی باتیں کون کرے دلگیروں سے

احمد شمیم کے انداز کی ایک خصوصیت ان کی شاعری کا لب ولہجہ ہے۔ان کی زبان میں باتوں کا انداز ہے۔عموماً کسی نہ کسی سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ خود سامنے موجود ہیں۔اسے ہم ''میر'' کا رنگ بھی کہہ سکتے ہیں۔

میں دیکھوں اور صدیاں دیکھیں خاک ہوئی گلزار میاں
کیا کیا لالہ کفن تھے سارے راہ وفا میں یار میاں

میر ملیں تو ان سے کہیو اب بھی اس دکھ نگری میں
تیرے بہانے اپنے فسانے کہتے ہیں دکھیارے لوگ

اس قدر تاریک تنہائی کا زنداں تو نہ تھا
یاد کا روزن بھی جیسے بجھ گیا ہو دوستو!

شمیم نے اپنا بچپن سری نگر کشمیر میں گزارا تھا۔تقسیم کے بعد پاکستان آئے۔۱۹۶۵ء کی جنگ

اور ۱۹۷۱ء کے سقوط ڈھاکہ کا منظر بھی انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں، ویت نام کی جنگ آزادی، فلسطین کے خونچکاں منظر اور کشمیر کے حالات یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا۔ وحشیانہ کاروباری اور زمینی توسیع پسندی کی دوڑ میں انسانوں کا درندوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹنا اور شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کی خاطر کروڑوں بے گناہ انسانوں کے خون کے دریا رواں کرنا اور پھر جشن منانا شمیم کو یہ سراسر غیر انسانی سرگرمیاں خون کے آنسو رلاتی تھیں۔

جانے کیا ہوگیا ہے رنگِ چمن
زخم ہیں شاخ شاخ پر لوگو

اپنے غم کا کب ماتم تھا، پہلے کب یہ عالم تھا
جلوت و خلوت ذکر الم ہے عالم دیدہ گریاں ہے!

احمد شمیم محکمہ اطلاعات سے وابستہ تھے۔ جس وقت اقتدار استحصالی اداروں کے ہاتھ میں ہوا تو شمیم نے یہ جانا کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے جو شعور پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ جھوٹا شعور ہے کیونکہ اس کا مقصد معاشرے میں محض Yes man پیدا کرنا ہے۔ شمیم کو اس کا احساس تھا وہ یہ ادراک رکھتے تھے کہ مجھ سے اس ادارے میں کیا کام لیا جارہا ہے۔ ان کی زندگی کے اس رنگ میں ان کی شاعری کے چند نمونے:

جو خبریں شام کو میں خود بنانے بیٹھا ہوں
سویرے ان پہ مجھی کو یقین کرنا ہے

مجھے تو سچ کی طرح جھوٹ بولنا ہے یہاں
عبث ہے کوئی اگر آئینہ دکھاتا ہے

شرم کے مارے مجبوری کو فنکاری کہتا ہوں
اک چہرہ ہے میرا گھر میں، اک چہرہ دفتر میں

یہ وہ منظر ہے جہاں الفاظ روح سے خالی معلوم ہوتے ہیں اور شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

پیڑ خالی دیکھ کے موسم سے ڈر آنے لگا
لفظ خالی دیکھ کے اپنا ہنر یاد آگیا

غبار لفظ میں معنی تلاش کرتا ہے
کہ ریگ زرد کے دریا سے پار اترتا ہے

لفظ سے اب ایک ہی رشتہ میرا باقی رہا
زندہ رہنے کے لیے جو تم کہو لکھا کروں

کوئی ایسا لفظ ، لفظوں کے گھنے جنگل میں ہو
جس کی آہٹ دل میں گونجے اور میں چونکا کروں

ن۔م راشد لکھتے ہیں:

''شعر براہ راست فرد یا جماعت کے لیے"لائحہ عمل" بھی تیار نہیں کرتا لیکن احساسات اور جذبات میں اس قسم کے تغیرات ضرور پیدا کرتا ہے جو فرد کو نئی فکر پر آمادہ کریں۔گویا شعر انسانی دماغوں کے اندر محض مکھیوں کی طرح بھنبھناہٹ نہیں بلکہ یہ شہد پیدا کرنے کی کوشش بھی ہے۔احمد شمیم کے یہاں بھی لامحالہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو مختلف جذبات واحساسات میں مثبت تبدیلی وتغیر پیدا کر سکتے ہیں۔''(۳۶)

اپنے لہو میں ڈوبنے والے لوگ ہی پار اُترتے ہیں
تم اس کاغذ کی کشتی میں کیا اترو گے پار میاں

تن کی ڈھال ابھی باقی ہے ریزہ ریزہ ہونے کو
تم مت سوچو ہم بے بس ہیں چھن جوگئی دستار میاں

شمیم کی غزل میں ہمیں لفظوں کی ترتیب، چناؤ اور جو رچاؤ نظر آتا ہے وہ منفرد ہے۔ان کا انداز بیاں رواں ، دواں ، شگفتہ اور شائستہ ہے ۔ ان کی غزل کی تڑپ، اضطراب اور تیز رفتاری ، جدید ذہن کو چونکانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔احمد شمیم ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے جدید غزل کا چیلنج بڑی خود اعتمادی کے ساتھ قبول کیا اور اس خود اعتمادی کا ثبوت ان کی اپنی غزل ہے۔وہ سماج کو بدلنے کا شعور رکھتے ہیں اور حسرت تعمیر کی تڑپ ان کے سینے میں موجود ہے۔

وطن کی محبت اور کشمیر کی آزادی جہاں ان کا خواب رہا وہاں ان کی شاعری میں بھی یہ احساسات وجذبات شدت سے موجود ہیں:

طویل کشمکش کے بعد ان پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ جس فضا میں وہ سانس لے رہے ہیں وہ بانجھ ہو چکی ہے۔ہم سب جس راہ پر چل رہے ہیں یہ حقیقی آزادی کی راہ نہیں۔آزادی کی راہ لہو کی راہ ہے جس پر چلنے سے ہم سب گریزاں ہیں۔ہمارے الفاظ عمل سے تہی ہونے کی وجہ سے کھوکھلے اور بے معنی ہیں۔شمیم ایک سچے اور کھرے فنکار تھے۔شمیم نے کم غزلیں کہیں لیکن جو کچھ کہا وہ انتخاب کی صورت میں ہے اور اس سے ان کا ایک منفرد لہجہ سامنے آتا ہے جو ان کی شخصیت کا بھی پرتو ہے۔

احمد شمیم کی ہندی انگ میں شاعری

احمد شمیم نے اس طرح ہندی انگ میں غزل بھی لکھی۔ مثلاً

اک جوگی تھا جس کے بانی گاتے تھے ہم لوگ
اپنا درپن چھوڑ کے اس جوگی نے بسایا چاند
دھرتی پر خوشبو، پروا، صبح کی میٹھی نیند
امبر پر وہ نور کا دھارا، سورج تارا چاند!
بات کا امرت بھی دھوکا ہے نین کا کاجل بھی دھوکا
دل کا روگ بنا کرتے ہیں پیارے آنکھ کے تارے لوگ

احمد شمیم کے سارے مجموعہ ہائے کلام میں چند نظمیں، چند غزلیں، ہندی انگ میں ہیں، جس سے میراجی کے اثر کا پتہ چلتا ہے۔ اس اظہار کے لیے ایک نئی زبان، ایک نئے اسلوب اور ایک نئے اسلوب کی ضرورت تھی جس کا سراغ ہمیں احمد شمیم کی اکثر نظموں میں ملتا ہے۔

من پاگل ہے
سانجھ سے سے دیکھ رہا ہے
سوچ رہا ہے
میں ساگر تو چاند
سکھ سنگیت کا بہتا دریا
گہری کالی رات
(دوری)

ہر پل اپنا
سکھ کا سپنا
ہر دھڑکن اک گیت
ہر لمحہ اک میت
(اندھیرا اور اندھیرا)

پربت پر گیان میں گم جوگی
اس آگ کے بہتے دریا کا
سفاک نظارہ دیکھے گا
اور اپنے آپ سے پوچھے گا
اس گیان کا انت یہ لاوا ہے
جو مکتب و مسجد و مندر میں
سو دھیان دھرم کا روپ لیے
خود اپنے آپ سے چھپتا ہے

(روپ بہروپ)

سانجھ سے پربت کی اوٹ سے
چڑھتے چاند کا چہرہ لے کر
دکھ کے ٹھہرے گہرے ساگر
میں طوفان اُٹھاتا ہے
ساحل کی زنجیریں توڑو!
لہروں کو سمجھاتا ہے
کل جو بادِ خزاں کی صورت
میرے جیون کے مرجھائے
پتوں کو کاندھوں پہ اٹھائے
دور کی نگری بھاگ چلا
جن رستوں پر جیون کاٹا
اُن رستوں کو تیاگ چلا
گہری رات کے سناٹے میں
دکھ کی جلتی چھایا بن کر
پھر وہ لمحہ دروازے پر

دستک دینے آیا ہے
اُس لمحے کا من پتھر ہے
پھولوں جیسی کایا ہے! (چارہ گی)

شبدوں کے یہ کنکر لے کے
سپنے بیچ کے آیا ہوں
بالک بن کے شبدوں سے میں اپنا من بہلاتا ہوں (اَن کھی)

کشمیری غزل کی روایت اور احمد شمیم

جہاں تک دنیا کی زبانوں کا تعلق ہے تمام زبانوں کی ابتداء شاعری سے ہوئی ہے، چاہے انگریزی زبان ہو یا عربی یا دیگر زبانیں۔ دنیا میں ابتدائی زبان شاعری ہی تھی لوگ قافیہ اور ردیف آمیز زبان لکھتے تھے اور یہی نثری زبان ہوتی تھی۔

شاعری میں غزل کا اہم درجہ ہے۔ غزل انسانی جذبات سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ واردات قلبی کا نام غزل ہے۔ غزل کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں شاعر لطیف پیرائے میں واردات قلبی کا اظہار کرتا ہے اور خوبصورت طریقہ سے عوام الناس تک بات پہنچاتا ہے اور پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ بات تو میرے دل کی ہی بیان ہوئی ہے۔ دُکھ درد، پریشانی، حزن وملال، غم فردا یہ ساری باتیں انسانی زندگی کا خاصہ ہیں۔

کشمیری زبان کی شاعری "للہ عارفہ" سے سو سال پہلے شتی کنٹھ کی مہانے پرکاش سے شروع ہوتی ہے۔ للہ عارفہ ۱۳۵۱ میں پیدا ہوئیں۔ جبکہ شتی کنٹھ نے مہانے پرکاش لگ بھگ ۱۲۵۱ میں لکھی۔ شتی کنٹھ کی کتاب رام شاستری نے ۱۹۱۸ء میں دوبارہ چھاپی۔ شتی کنٹھ سے لے کر موجودہ دور تک کے قادر الکلام شعراء کا کلام کشمیری ادب میں موجود ہے۔

جس طرح اردو غزل میں ہم غالبؔ اور میرؔ کے بغیر آگے نہیں بڑھتے اسی طرح کشمیری ادب میں "مہجور" اور "آزاد" کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ شتی کنٹھ، للہ عارفہ، نورالدین رشی حبہ خاتون نے بھی واردات قلبی کا اظہار کیا۔

عبدالاحد آزاد نے ان شعراء کے کلام کو یکجا کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ آزاد ایک غریب آدمی تھا، اُس نے محنت سے کام کیا، کوئی اور شخص جس کے مالی وسائل اچھے ہوتے تو یہ کام سرانجام دیتا تو بات ہی کچھ اور ہوتی لیکن تحقیق کا کام کرنے والوں کے سامنے منزل کتنی دور اور راستہ کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو انہیں

اس کام سے راستے کی کلفتیں اور اذیتیں نہیں روک سکتیں۔وہ تخلیقی راہوں پر دم بدم گامزن رہتے ہیں۔

جناب علی جواد زیدی "کشمیری زبان اور کشمیری شاعری" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور سچ تو یہ ہے کہ کشمیر میں شاعری اور ابتدائی نثر کے نمونے بھی نایاب ہیں۔

کشمیری زبان کے وجود کو اگر چہ بنایا تو سنسکرت زبان نے تھا، مگر خون فارسی زبان نے فراہم کیا اور اس طرح مختلف ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی یہ شعری صنف جدت اختیار کرتی ہوئی ہر دور میں کامیابی کے ساتھ چلتی رہی اور اس میں خوبصورتی بڑھتی گئی۔

"کہ لولو گیت وغیرہ کے زیر اثر کشمیری غزل ٹوٹے مکان تک پہنچ گئی۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لولو گیت کی ایجاد کا سہرا حبہ خاتون کے سر ہے۔(۳۷)

فاضل مقدمہ نگار نے عبدالاحد آزاد کی تخلیقات پر مقدمہ لکھا ہے۔غالباً "لولو" کے بارے میں جو نگارشات آپ نے کی ہیں وہ جواد زیدی کی نگاہ سے نہ گذری ہوں وہ لکھتے ہیں:

"کشمیر کے ایک حکمران وزیر............اپنے چچازاد بھائی کی بیوی "لولو" پر عاشق ہوا۔عشق کی وجہ سے عشق کے راگ الاپنے لگا۔'لولو' ہر وقت ورد زبان رہتا تھا چونکہ یہ ناکام محبت کے جذبات تھے اس لیے اس میں خاص جاذبیت پیدا ہو گئی اور 'لولو' کے نام سے یہ گیت مشہور ہو گئے۔'لولو' گیت ہم اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ غزل جس شکل میں بھی ہو واردات قلبی کا اظہار ہے۔لہٰذا ہم غزل کو لولو گیت سے ہی شروع کرتے ہیں۔(۳۸)

پس غزل کی روایات کشمیری ادب میں دوسرے علوم کے ادب کی طرح بہت قدیم ہیں اور عظیم تغزل لل عارفہ، نورالدین رشی حبہ خاتون، خواجہ حبیب اللہ، بھی شعراء کے کلام میں شامل رہا۔

جدید کشمیری غزل کو بام عروج پر پہنچانے میں غلام احمد مہجور نے اہم کردار ادا کیا ہے۔۱۹۲۶ء میں غلام احمد مہجور نے موسم بہار کی نسبت سے مشہور غزل لکھی اور حقیقت میں یہی وہ غزل ہے جس نے مہجور کو دنیائے شاعری میں مقبول عام کیا اور اس غزل نے بیرون کشمیر بہت زیادہ شہرت حاصل کی اور اس دور کی مقبول ترین غزل بنی جو گھر گھر گنگنائی جانے لگی۔اس غزل نے اپنی خوبصورتی، شہرت و مقبولیت کی وجہ سے کشمیری زبان کو پھیلانے میں بہت زیادہ معاونت کی اور ادبی حلقوں میں کشمیری شعر و شاعری کو اپنا

آپ منوانا آ گیا۔(۳۹)
غلام احمد مجبور کی غزل کا ترجمہ پیش ہے جو عام لوگوں میں بہت مشہور ہوئی۔

ترجمہ :

ان اشعار میں "مجبورؔ" دیہات کی غریب لڑکی کے دل کو تسلی دیتے ہوئے
کہتے ہیں کہ" اے خوبصورت دیہاتی لڑکی تیرے ساتھ امیرزادیوں کا
کیا مقام ہے تو ایسی خوبصورت شے ہے کہ پھول تیرے لیے اپنا دل نچھاور
کرنے کو تیار ہیں"۔

کشمیری غزل میں غلام احمد مقبول، غلام نبی خیال، طاؤس بانہالی اور نشاط انصاری ایسے شعراء ہیں جنہوں نے غزل میں اپنی شاعری کے خوبصورت جوہر دکھلائے اور اسی تناظر میں ہم احمد شمیم کے شعری ادب میں کشمیری غزل کے بارے میں میلان اور رجحان کا بالکل واضح طور پر اپنے پیشرو شعراء جن میں خصوصی طور پر غلام احمد مجبور کا کلاسیکی انداز بہت زیادہ نمایاں ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ احمد شمیم غزل میں مکمل طور پر مجبور سے متاثر تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

کشمیری شعری ادب کے تناظر میں احمد شمیم کی غزل میں مجبور کا اثر اور خاص طور پر کلاسیکی انداز بہت نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ مجبوری ہیں جو احمد شمیم کو کشمیری زبان سے امرت کا گھونٹ گھونٹ بھر پلاتا جاتا ہے اور دور پردیس میں (احمد شمیم) کو اپنی زبان کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ احمد شمیم نے جہاں زندگی بسر کی وہاں اردو کی روایات بہت مستحکم تھیں۔ خود احمد شمیم بھی اردو ادب میں نام کما چکے تھے اس لیے وہ اُردو کا ذہن لے کر کشمیری زبان کے اسلوب کو نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کشمیری اشعار میں اُردو اسلوب جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ایک غزل کے اشعار کا ترجمہ:

زونـہ ھنـدیٔ پـاٹھی تـارکـن ھنزچو، نـۄ وتھراوس وتن
بـالـی راتھـا نیـرِ نـاسـالـس سُــہ حنكُ آفتـاب
آس دل ھتـہ یـام بُـوزم چـاوِ نـظـرن ھُنـٗد شـراب
چھـا دوّیـمِ پیمـانـہ ،ھُیتـہ پیمـانـہ پیمـانـن انـدر

ترجمہ :

"چاندنی کی طرح میں اپنے محبوب کی راہوں میں ستاروں کا قالین بچھانا چاہتا
ہوں اور میرے محبوب کاش رات بھر کے لیے، اے میرے محبوب، اے حسن

آفتاب تو کسی کی دعوت پر سیر کو نکلے گا اور میں نے جب سے سنا ہے کہ میرا
محبوب آج حسن نظر کی شراب نوش کرنے کے لیے نکلا ہے تو کیا دل کے علاوہ
کوئی اور ایسا پیمانہ ہے جو کہیں کسی پیمانے کے اندر ہو۔''(۳۰)

احمد شیم کے مندرجہ بالا اشعار میں لفظ پیمانہ تینوں جگہ پر الگ الگ بہار وخزاں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ اشعار صرف اسی شاعر کا خاصا ہیں جس نے اردو شاعری کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہو۔آگے چل کر احمد شیم اس انداز سے گویا ہوتے ہیں۔

احمد شیم کی تصنیف ''وگ تہ داغ'' جو کشیری غزلوں کا مجموعہ ہے۔اس کی چند غزلوں کے اشعار پیش ہیں۔اس غزل میں احمد شیم نے اپنے ملک کی بہار کے بارے میں لکھا ہے:

د نیا چُھ چھاوان گُل تہ خوشوُن واو، بہار آو
أسہ بس یتُے ھاوس چُھ سُہ یار آو بہار آو
موژھاریہ ژھایے گرایہ ماران ژل ژواو کی پأٹھی
أسہ نش تہ ساتھا بیھو قدم ٹھراو، بہار آو!

ترجمہ:

''کشمیر کی آزادی کے بارے میں جو آراء ہواؤں کی طرح چلتی تھیں ان ہواؤں میں کشمیر کی آزادی کا پیغام ہے۔ہواؤں نے یہ قرارداد منظور کی اور فیصلہ دیا کہ کشمیر میں رائے شماری ہو گی اور کشمیر آزاد ہو جائے گا۔لوگ واپس اپنے وطن چلے جائیں گے۔اے میرے محبوب وطن تو ہم سے ہواؤں کے دوش پر ہی گفت وشنید کرتا ہے اس طرح یہ نہیں چلے گا۔اے میرے وطن آ ہم آزادی کی فضاء حاصل کریں اور کچھ لمحات ایک ساتھ گزاریں۔

پیار ومحبت زندگی کے لیے بہت قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔لاشعور میں محبت اور پیار ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔اپنے وطن سے دور محبوب کی خاطر اپنی ہر قیمتی چیز، والدین، بہن، بھائی سے زیادہ چاہا۔وہ اپنی سرزمین کو قیدی نہیں دیکھ سکتا۔''

اسی طرح ایک اور غزل میں احمد شیم محبت کی حقیقت سے ہمیں اس طرح آشنا کرواتے ہیں:

تھوُو گاٹلوا تہ ناو مژر لولہ، متو لول،
ھر دس اندر بُلبل تہ گالان یھان گُلُن ستی،

ترجمہ :

"داناؤں نے محبت کو پاگل پن قرار دیا ہے، جنون قرار دیا ہے لیکن دل
اور خوبصورت معصوم دل رکھنے والے نے اس کو پیار کا نام دیا ہے۔خزاں جب
بھی آتی ہے تو وہ پھولوں کو مرجھا دیتی ہے۔اگر چہ وہ بلبل کو کچھ نہیں کہتی مگر اس
کے باوجود بلبل چہچہنا بند کر دیتی ہے۔"

روٹ گلالن ذاغ منو منزہار، گوآرے ولن
زانہ کیاہ اتو مانو گائلُ ، زانہ بُلبل زانہ، بو،

ترجمہ :

"گل لالہ نے اپنے من میں ایک داغ پالا ہے اور وہ ندی نالوں اور بیابانوں کا
عاشق ہے۔یہ ایسی باریک باتیں ہیں جو افلاطون بھی نہیں سمجھ سکتا۔اس بات کو
صرف میں (شمیم) سمجھ سکتا ہوں یا بلبل سمجھ سکتی ہے۔"

احمد شمیم کا شمار ان چند ایک ادبی شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے بیک وقت دو یا دو سے زیادہ زبانوں میں شاعری کی اور مقبولیت حاصل کی اور جب اسی بات کو ہم اردو اور کشمیری زبان کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو غلام احمد مجور کے بعد ہمیں احمد شمیم ہی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے بیک وقت دونوں زبانوں میں یکساں اعلیٰ حیثیت اور مقام حاصل کیا حالانکہ اور بھی کئی شعراء گذرے ہیں جنہوں نے ان دونوں زبانوں میں شاعری کی مگر انہیں اتنی مقبولیت نہ حاصل ہوئی مگر احمد شمیم کے بارے میں تمام اردو اور کشمیری زبان وادب کے حلقے فخریہ انداز میں شمیم کو اپنا شاعر مانتے ہیں۔

انہوں نے شاندار انداز میں شاعری کی۔خواہ اُن کی اُردو غزلیں ہوں یا کشمیری زبان کی غزلیں یا پھر اُردو کی طویل اور چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی آزاد نظمیں ہوں یا کشمیری زبان کے وژن ہوں بالکل ہم پلہ ہیں۔لہٰذا احمد شمیم بجا طور پر اس اعزاز کے مستحق ہیں کہ انہوں نے دونوں زبانوں میں یکساں طور پر مقبولیت پائی۔

ہمیں احمد شمیم کی کشمیری زبان وادب کی خدمت زیادہ تو نہیں، مناسب طور پر کافی نظر آتی ہے کیونکہ دیار غیر میں بیٹھ کر اور خاص طور پر اس ماحول میں رہتے ہوئے جس میں بیشتر کشمیری حضرات اپنی مادری زبان تک کو بھول گئے ہیں، ایسے میں احمد شمیم کی یہ کوشش بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔انہوں نے باضابطہ طور پر کشمیری زبان میں جو بھی لکھا اس میں ہمیں صرف "وگ تہ داغ" کتاب ملی جو ہمارے پاس باقاعدہ

مالا کے طور پر محفوظ ہے۔ کشمیری ادب کی اس مالا میں شمیم کی ۲۷ غزلیں وژن کے ساتھ موجود ہیں اور انہوں نے جس انداز میں غزلوں کی یہ مالا بنائی ہے وہ کشمیری زبان وادب کے ادبی ذخیرے میں شاندار اور انمول اضافہ ہے۔ مہجور کے انداز میں کلاسیکی طرز کو اپناتے ہوئے شمیم کی غزلیں بے حد خوبصورت ہیں ان میں واردات قلبی کے عناصر تو ہر حال میں ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ کشمیر کی خوبصورتی اور خوبصورت عوام کی بدحالی کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ایک دوسرے کے بین بین ہیں۔ قدرتی حسن، واردات قلبی کے بارے میں زبردست ربط پایا جاتا ہے۔ ایک نئی صنف شاعری کی ہے جس میں واردات قلبی، فطری مناظر اور قدرتی حسن ایک ساتھ شامل ہیں۔

شمیم یہاں ایک ذاتی دکھ کا اظہار کر رہے ہیں:

یـوُد دُبِ بھـگـہ ژورِ وَنـن ،سـورِ یـاوُن میـون
اد، کـاُلـی روزی گـراو،ژ، رھـے ھـاو بھـار آو!

ترجمہ:

مفارقت کا وہ داغ جو اپنی گم شدہ محبوبہ کی وجہ سے ہر وقت تازہ دکھتا ہے اور کہتا ہے ہیں کہ اے میری محبوبہ کہاں بن باس میں تو گم ہوگئی ہے میری آنکھوں سے تو اوجھل ہے تیرے بغیر میری زندگی کیا ہے یہ تو ایک دن ختم ہو جائے گی اے میری بہاروں کے محبوب کب وصال ہوگا ایک دفعہ تو اپنا جام وصال مجھے پلا اپنا چہرہ دیکھا۔

احمد شمیم نے جس خوبصورتی سے کشمیری غزل میں واردات قلبی کو اپنے احساسات وجذبات کو لفظوں کے روپ میں ڈھال کر بیان کیا وہ بے شک بے مثال ہے۔ ان کی غزلوں میں وطن کی جدائی، وطن کی آس اور سنگدل محبوب کی پردہ داری بہت خوبصورت الفاظ میں زندگی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ چونکہ کشمیری کا اردو میں ترجمہ کرنا جان جوکھوں کا کام ہے، خاص کر کشمیری غزل کا یہ تو کوئی کشمیری شاعر ہی کا کام ہے۔ اگر طاؤس بانہالی ہوتے تو وہ یہ کام بہت خوبصورتی سے کرتے۔ اب بھی میں شکرگزار ہوں تو یہ شیخ کی، جنہوں نے یہ ترجمہ کیا اور یہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے کشمیریات میں شامل ہوا، جس کے نگران ڈاکٹر یوسف بخاری پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ہیں۔

احمد شمیم کے انگریزی تراجم

Sajjad Shaikh's Translation of Ahmad Shamim's Poem:

''ریت پر سفر کا لمحہ''

The Moment of Traveling on Sand

Once we were charming!
Our breath was still
Like fragrance found in books

We drew pictures
Using several unsaid words
We wrote poems on bird's wings
For people living along distant lakes
They were far away from us,
But actually lived within us!

With the first ray of light, at dawn,
A new day's journey began.
We said:
Mother! Butterflies, wings are
Extremely beautiful!
Please kiss us good bye.
Upon our foreheads,
Because we are bound
For the land of butterflies,
The land of fireflies!

Fireflies of colours,

Butterflies of light

Call us.

A new day's journey,

Beside the breeze

Drenched in colours

Beckons us from the window.

Please, kiss us goodbye,

On our foreheads.

پروفیسر سجاد شیخ جو احمد شمیم کے بہت عزیز دوستوں میں سے ہیں اور نظموں کا بہت خوبصورت انگریزی ترجمہ کرتے ہیں ۔ انہوں نے شمیم کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، جن میں سے چند نظمیں "ریت پر سفر کا لمحہ"، "ایک نظم" "واپسی کی مناجات" کا انگریزی ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

ریت پر سفر کا لمحہ

کبھی ہم خوبصورت تھے

کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت

سانس ساکن تھی

بہت سے اَن کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے

پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر

دور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے

جو ہم سے دور تھے

لیکن ہمارے پاس رہتے تھے

نئے دن کی مسافت

جب کرن کے ساتھ آنگن میں اترتی تھی

تو ہم کہتے تھے ___ "امی"

تتلیوں کے پَر بہت ہی خوبصورت ہیں

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

کہ ہم کو تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے

ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو!

Ocean of Grief

(Aik Nazam)

Tied in a chain
Formed by links with links
of smouldering, stone-hearted moments.
My hand is placed upon my heart.
I mourn.
Your head is covered with dust.
You also mourn.

I am a prisoner
of the bygone moment
That linked you with me.
The magic of coming, unseen moment
Is a chain for you, my life!
Bound
In the links within links
of this fiery chain,
We'll melt like snow,
Slowly and steadily,
And change in to an
Unfathomable Ocean of grief.

ایک نظم

حلقہ در حلقہ سُلگتے سنگدل لمحوں کی اک زنجیر میں
دست بر دل میں بھی ہوں نوحہ کناں
خاک بر سر تو بھی ہے ماتم کناں ___!

اس گھڑے لمحے کا زندانی ہوں میں
جس نے وابستہ کیا تجھ سے مجھے
آنے والے لمحۂ نادیدہ کی جادوگری
میری جاں تیرے لیے زنجیر ہے!
سلسلہ در سلسلہ پھیلی ہوئی اس آتشیں زنجیر میں
لحظہ لحظہ برف کی صورت پگھل جائیں گے ہم
دکھ کے بے پایاں سمندر میں بدل جائیں گے ہم

Ahmad Shamim

"Desire to return"

(Urdu: Waapsi ki Munajaat)

Every day the river comes,
Carrying the shadow of my home
And stops at my door.

☆

Every night the moon
Bends over my roof
To tell me the tale of my home.

☆

I say:
"O" River! Ancient River!
Who is standing at the door
of my home?
He says:
"Your Mother awaits you
carrying mountain snow in
her hair!"

☆

I say:
"O" Moon! Thinking moon!
What have you seen

In my home?

He says:

"Now there is no image

In the mirrors of your home!"

☆

I say:

"My Good River!

My Dear Moon!

Tell me plain.

How is my home?

☆

They say:

"Like a garden if

you were there.

But a desert with out you!

☆

I say:

"My good river!

My dear Moon!

Tell my mother to transform

The desert into a garden,

For I must return home

Some day!"

واپسی کی مناجات

ہر دن دریا
میرے گھر کا عکس اُٹھائے
میرے دروازے پہ آ کر رک جاتا ہے

ہر شب چندا
مجھ کو گھر کی بات سنائے

میری چھت پر جھک جاتا ہے

میں کہتا ہوں

دریا ____ اے برسوں کے دریا

میرے گھر کے دروازے پر کون کھڑا ہے

وہ کہتا ہے! تیری امی،

اپنے بالوں میں پربت کی برف سجائے

تیرا رستہ دیکھ رہی ہے

میں کہتا ہوں

چندا ____ جگمگ کرتے چندا

میرے گھر میں کیا دیکھا ہے

وہ کہتا ہے

تیرے گھر کے آئینوں میں

اب کوئی تصویر نہیں

میں کہتا ہوں

اچھے دریا

پیارے چندا

کہو میرا گھر کیسا ہے

وہ کہتے ہیں

تم ہو گے تو گلشن ہوگا

ورنہ تو اک صحرا ہے

میں کہتا ہوں!

اچھے دریا

اچھے چندا

میری امی سے کہہ دینا

صحرا کو گلزار بنائے

مجھ کو اک دن لوٹ آنا ہے

Younas Ahmer's ***Translation of Ahmad Shamim's Poem:***

اے ہری فصلوں کی دوشیزہ تجھے اغوا کروں
تجھ کو تجھ ہی سے بچانے کے لیے ایسا کروں
جنگلوں کا خوف شہروں کا مقدر بن گیا
میں بھی سب لوگوں سے چھپ کر خواب میں رویا کروں
اس سفر میں اک سنہری سرزمیں کے خواب سے
خود کو بہلاتا تھا، اب بچوں کو بہلایا کروں

Oh the young damsel of green crops let me kidnap you.
This I would do to save you from yourself.
The fear of jungle has become the fate of cities,
Concealed from everybody, I would weep in dream.
In this journey, from the dream of a golden land.
I used to amuse myself and now
I would amuse my children,
Or surprisingly when he looks around, he says;
Somewhere here might be the dwelling house of magicians,
.... Are flowing upward

سفر فریب ہے، منزل بھی ایک دھوکا ہے
ہر ایک رستے کے آخر پہ ایک صحرا ہے
مجھے خریدا گیا جھوٹ بولنے کے لیے
مری سزا بھی وہی ہے جو میرا پیشہ ہے

Deceit is the journey and alluring is the destination,
There is a desert at the end of each path,
I have been purchased to tell a lie,
Penalty is the same as is my profession.

منیرہ جانِ من، جب آسماں سے ریت گرتی ہے
تو کوئی آہنی کھڑکی پہ دو ہونٹوں کے انگارے سجاتا ہے
لہو میں کالی صدیوں کی صدائیں گونج اٹھتی ہیں
تو ہم آواز کے رستے کو تھامے
سانس کے ٹوٹے ہوئے پل سے گزرتے ہیں!
— سلگتے ذائقے کو جسم میں یکطرفہ بہنے دو

خدا رحمٰن ہے اور بخشنے والا ہے
شاید ہم کو گیلی رات کے ماتھے پہ لکھے لفظ کو
پڑھنے کی ہمت دے!!

Munira, my love,
When sand falls from the sky
Somebody kindles the flames of two lips
Standing at the iron window and sounds echo of black centuries in blood
And then holding the rope of the sound
Pass through the broken bridge of our breath
Let the fiery savor flow in the body.
God is merciful and forgiving,
Perhaps He may give as courage to read the
Written word on the forehead of the wet night.

And this is Ahmed Shameem who, despite the feeling of rootlessness, is not surrounded by the chiaroscuro of despair.

یا نبیؐ تیری شفا برسے گھٹا کی صورت

ہم بھٹکتے ہیں خلاؤں میں صدا کی صورت
ہمیں کون سنتا ہے ہمیں حرفِ دُعا کی صورت

نہ کوئی خواب نہ خواہش نہ تمنا کوئی
دل بھی اک عمر سے ہے دستِ گدا کی صورت

ریت ہی ریت ہے شہروں کا مقدر گویا
کسی گوشے میں نہیں صوت و صدا کی صورت

دشتِ جاں پر کسی آواز کا سایہ بھی نہیں
دل لٹا خیمہ گہہ اہلِ وفا کی صورت!

ہونٹ ہنستے ہیں تو دل زہر سے بھر جاتے ہیں
بادِ صرصر بھی چلے بادِ صبا کی صورت

کس کو پتھر میں نظر آئے گا چہرہ اپنا
کون دیکھا کرے اب رہنما کی صورت

لفظ معنی سے تہی اور عبارت کی جھوٹی
جیسے صحراؤں میں نقشِ کفِ پا کی صورت

دل کبھی طائفہ بیم و ستم میں تو نہ تھا
لوگ کیوں ملتے ہیں پھر ہم سے سزا کی صورت

آنکھ افسوس کے منظر کے سوا کیا دیکھے
سیلِ نغمہ بھی لگے سیلِ بلا کی صورت

اب فرات آنکھ میں کیا ڈالے بجز ریگِ ستم
وہ جو پیاسے تھے گئے حرفِ دعا کی صورت

پھر وہی حرفِ ابد گنج ازل سے اُترے
پھر جہاں اُٹھے مہک غارِ حرا کی صورت

دل کے صحراؤں میں گونجی ہے دعا زمزم کی
یا نبیؐ تیری شفا برسے گھٹا کی صورت

تیرے انفاس میں چمکا ہے سماوات کا نُور
تیری صورت میں نظر آئی خدا کی صورت

ریت میں پھول کھلے تیری محبت کے طفیل
دھوپ ویرانوں پہ برسی ہے گھٹا کی صورت

☆

ہم سفر دوستوں سے بچھڑنے کی رُت آ گئی
اپنے خیموں سے یادوں کی قبائیں پہن کر چلو

☆

ہر ایک زنجیر سے رہائی کی آرزو میں
میں بہتے دریا کے ساحلِ بے نمود پر آ گیا
کنارِ ساحل شجر کی چھاؤں میں
اپنی میت کا بوجھ اُٹھائے میں منتظر ہوں
کوئی تو برگِ خموش شاخِ شجر سے ٹوٹے
جو میری عریانیٔ بدن کا کفن بنے
مجھ کو ڈھانپ جائے۔!

☆

پرانی اشتہا کو اپنی آنکھوں میں سنبھالو
آسماں کو چھونے والی اک عمارت جنگ کے رستے میں آئے گی

جہاں کمپیوٹروں کے طے شدہ ذہنوں میں ہندسے ہیں
ہمارے نام کا کوئی...... مگر ہندسوں پہ کس کا نام ہوتا ہے
ہماری بھوک میں اور بنک میں بھی ایک رشتہ ہے!
یہی کہتا ہے دادا...... جس نے برسوں قید کاٹی ہے
(مگر دادا کی دانش نیم بنیا ہے
برسوں کی اذیت سے)
یہی کہتے ہیں فتوی لکھنے والے لوگ...... جو
کاروں میں پھرتے ہیں!

☆

پرے افق پہ خنک چاندنی کے دامن میں
کچھ اس قرینے سے ابھرا ہوا اک گاؤں
کہ جیسے اپنے ہی خوابوں کی کوئی بستی ہو
گھنے درختوں کے گمبھیر گہرے سایوں میں
چمکتے جگنو جھلک دو گھڑی دکھاتے ہیں
(اک ایسی خواب کی بستی ہمارے دل میں بھی تھی
کوی کے دھیان کا ڈھالا ہوا وہ روپ نگر
جہاں سکوت بھی نغمہ تھا، خامشی بھی صدا
......اب ایک یاد ہے، کچھ دکھ بھری سی میٹھی سی)

☆

کب تک دن کے عریاں جسم پر
اپنے لہو کی بارشوں میں
اپنے ہونے کا ستم سہہ لیں

☆

"بند دروازے کے باہر
چڑھتے سورج کے اگن ارتھ پر
ہماری خواہشوں کی لاش ہے۔

☆

ساری شکلیں ایک سی تھیں

ساری شامیں ایک سی تھیں
سارے دن یکساں تھے
جبر کی زنجیر میں جکڑے ہوئے
جبر ہی قانون تھا۔!
جبر کی آواز پر ہم
دیدہ و نادیدہ زنجیریں اٹھائے
دن کے جھلسے کھیت میں بوتے تھے ناکامی کے داغ!
رات کو تنہائیوں کے دشت میں
کاٹتے تھے دیدہ و نادیدہ خوابوں کا عذاب!

☆

ستم کی ساعت طویل ہے
اور خواہشیں ڈائنیں ہیں جو
تیز ناخنوں سے تمام جسموں کو نوچتی ہیں
تمام خوابوں کی کھڑکیوں سے
کٹے ہوئے جسم جھانکتے ہیں۔

☆

تمام بستی میں
قتل گاہوں میں گرتے جسموں کی
گرم، سفاک بُو رچی ہے
ہم جنہیں زم زم میں نہلایا گیا
آج کیوں ناپام سے جھلسے ہوئے رستوں میں
بیٹھے ہیں اپاہج کی طرح

☆

نخل زیتون کا سراب!
کون سے الفاظ میں نظمیں لکھیں
جو اندھیری رات میں
گھوڑے کی ٹاپوں سے اُگیں

☆

نئی رُت کی دہلیز پر میں کھڑا ہوں
مگر خواہش وصل
ان سر بریدہ گئی ساعتوں میں کہیں گم
ابھی سوچتی ہے!
نئی رت کے در وا ہوئے بھی
تو حاصل بجز خسارِ غم کچھ نہ ہوگا
کہ وہ ساعت ناشگفتہ
یہاں بھی نہ ہوگی۔

☆

تُوت کے پتے پر ریشم کا اِک کیڑا
پتے کی مخمل سے ریشم کاڑھ رہا ہے
اپنے تن کو ڈھانک رہا ہے
.....ناداں کیڑا کب یہ جانے
اِک دن ریشم کے تاروں میں کھو جائے گا

☆

دو پلوں کی مسافت میں ہم
اجنبی خیمہ گاہوں میں ٹوٹی ہوئی سانس کو
دوسروں کی طنابوں سے باندھا کریں
اپنے حصے میں لکھے ستاروں سے گرتی ہوئی راکھ میں
آنے والے زمانوں کا چہرہ چُنیں!
اور سوچیں کہ پربت سے آگے کوئی شہر ہے

☆

اُٹھو نصف شب ہوئی ہے اسی جستجو میں نکلیں
کسی موڑ پر ملے وہ جسے پا کے کھو دیا ہے

☆

ہری رُتوں کی صدا پہ ہم اپنے گھر سے نکلے
تو ساری یادوں کا سر برہنہ جلوس

میلے لباس کی طرح تن سے اُترا
سفر کے پہلے قدم میں دیکھا
تو رنج و راحت کے زاویے سب بدل گئے تھے!
ابد صفت ماستا کے آنگن کی سر برہنہ پکار
گزرے دنوں کی ساری حکایتیں
سب بچھڑنے والوں کو سونپ دی تھیں
بچھڑنے والے! اماں توں کے عذاب میں تھے
بچھڑنے والوں کی واپسی کے سراب میں تھے
بچھڑنے والو!
میری صدا شہر سبز پرچم سے جب بھی سننا
ابد صفت ماستا سے کہنا
کہ میرے کمرے میں میرے کپڑوں دھول جھاڑے
میری کتابوں میں میرے ہاتھوں کے نقش دیکھے
خوش آنگن میں اُگتے پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پکارے
کہ آؤ.... اب شام ہو گئی ہے

☆

کبھی جو چہرہ و پہن کے نکلے تھے اپنے گھر سے
وہ راستے کے غبار میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہے
.... سلونی شاموں کی باس اُڑ کر کہیں سے آئے
تو ہم کو بچھڑے ہوؤں کی باتوں کے آئینے میں
وہ سارے منظر دکھائے جن کو ترس رہے ہیں
ہمارے کمروں گنگ ماضی کی دھول
ہر شے کو چاٹتی ہے
بس ایک روشن صدا ہے
جو دکھ میں بے کسی میں
کبھی اندھیرے میں اور کبھی دن کی روشنی میں
ہمیں بلاتی ہے اپنی جانب!

کبھی لپٹتی ہے عشق پیچاں کی بیل کی طرح ہم سے
بے اختیار جذبوں کی آگہی میں!
رگوں میں جو رنگ ہے
لہو میں جو تازگی ہے (اگر کوئی ہے
تو سب اسی کی سلگتی آنکھوں
مہکتی سانسوں کا معجزہ ہے!

☆

زخم بے نشاں!
اداس راتوں کو سونی راہوں میں
ہم تجھے ڈھونڈنے چلے ہیں
نہ جانے اب کتنے مرحلے ہیں!
ٹھہر،
سسکتی ہوا کے بے نام قافلے
ہم تری صدا کو
صبا کی آوازِ پا سمجھ کے
کھلے دریچوں کی کور آنکھوں
کھلے کواڑوں کے گنگ سینوں
کہ کتنے بے آب آئینوں میں
الجھتی امید کی خلش لے کے
جھانک لیں گے!

☆

ایک نظم

میری عمر کا سرکش گھوڑا
چلتے چلتے تھک جائے گا
اپنے لہو میں سورج، ستارے اور دھرتی بہہ جائیں گے
میں صدیوں کی نیندیں اوڑھ کے سو جاؤں گا
رُت کا فسوں
بارش کا نوحہ، بین ہوا کا

دن اور رات کے سب ہنگامے
مجھ سے جدا فریاد کریں گے
جانے والے، آنے والے۔۔۔ مجھ کو بھولنے کی خواہش میں
مجھ کو اکثر یاد کریں گے

☆

اک عصا در دست سائے نے کہا تھا
تم عدم کی سیڑھیاں چڑھتے چلو
چڑھتے چلو......
اک خلائے بے کراں میں
شاخِ طوبیٰ پر تمہارا گوہر مقصود ہے!

☆

جی بہت کرتا تھا پوچھیں... اے ہوا!
جن الوکھے جنگلوں سے تُو اُتر آئی ہے گھبرائی ہوئی
ان میں کیسی زندگی ہے

☆

غزل

بس کے شیشے میں گزرتے ہوئے منظر کی طرح
وہ ملا مجھ سے مگر بھاگتے لشکر کی طرح

میں بھی آوارہ ہوں، راہوں میں ہوا کی صورت
منتظر وہ بھی ہے، چپ چاپ صنوبر کی طرح

میری آنکھوں سے مگر رونقِ بازار نہ دیکھ
شہر ویراں نظر آئے گا تجھے گھر کی طرح

ایک سی کیفیتِ کرب کے زنداں میں ہوں
گھر بھی ہر روز چلا آتا ہوں دفتر کی طرح

رُت پلٹ آئی ہے پتوں پہ اداسی لکھنے
دھوپ آنکھوں میں اتر آئی ہے نشتر کی طرح

احمد شمیم کے خطوط

اردو ادب میں خطوط نگاری کا منفرد اور قابل توجہ دور غالب کے خطوط سے شروع ہوا۔ انہوں نے جس طرح اُردو شاعری میں اپنے لیے الگ راہ نکالی اسی طرح انہوں نے اردو نثر میں بھی ایک خاص طرز ایجاد کی۔ دراصل غالب نے غزل کی طرح خط کو بھی مشغلہ بنا لیا تھا اور اسی شوق میں پکار اُٹھے تھے:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب نے خطوط میں بے تکلفی، سادگی اور دلکشی کے عناصر داخل کیے۔ بیسویں صدی میں بہت سے مکاتیب نگار نظر آتے ہیں لیکن ان کا پیرائیہ اظہار غالب سے مختلف ہے۔ ان میں علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، جوش ملیح آبادی، صبا یاں اختر، فیض احمد فیض وغیرہ کے خطوط کے مجموعے شائع ہوئے۔ مجموعی طور پر خطوط میں ادبی و علمی رنگ و آہنگ غالب نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں بے تکلفی اور بے ساختگی بھی ملتی ہے بعض خطوط بہت طویل ہیں اس لیے کہ ان میں علمی مباحث زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ایسے بھاری بھرکم خط عموماً شگفتگی سے دور ہوتے ہیں لیکن یہاں ان کے انداز بیان کی برجستگی نے قابل توجہ بنادیا ہے۔

احمد شمیم کی پہچان ان کی شاعری کے حوالے سے ہے لیکن ان کی نثر میں ان کے خطوط بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے میرے علاوہ اپنے دوستوں آفتاب اقبال شمیم اور جمیل ملک وغیرہ کے نام بھی لکھے ہیں۔ ان خطوط میں موضوعات کا بے انتہا تنوع ہے پیار، محبت، حسن، عشق، ہجر و وصال، خود پسندی، خود فراموشی، خود بینی، تنہائی، کاہلی، شکایتیں، حکایتیں، وقت، نارسائی، شاعری، مطالعہ، فلسفہ، موت و حیات و کائنات، کشمیر کی خوبصورتی اور بچھڑے ہوؤں کی یادیں، درد جگر اور شکستِ دل کا مداوا موجود ہے۔

شمیم نے جو خطوط میرے نام لکھے، ان میں وہ ایک سچے عاشق اور بعد میں محبت کرنے والے شوہر

ثابت ہوئے۔ ان کی ہر ہر سطر سے ان کا خلوص ٹپکتا ہے اور جذبوں کی سچائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی وہ زندگی کے ہر ہر لمحے میرے ساتھ جئے۔

شادی سے پہلے بھی وہ مجھے باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے اور شادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان میں اکثر خطوط تین تین سو صفحات کے بھی ہوتے تھے، وہ خطوط میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔ میرے خیال میں وہ خط بہترین ادب کا حصہ ہیں۔

ان خطوط میں احمد شمیم کی گزرے دنوں کی یادیں، دوستیاں اور محبتیں، تمام بہاریں، سب برساتیں، سب شامیں، غروبِ آفتاب اور طلوعِ ماہتاب، رنگ و بو کا حسن اور لطف و انبساط کی بے انت وارداتیں بے پردہ نظر آتی ہیں۔

ان خطوط کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''محبت کو ہمارے معاشرے میں گناہِ کبیرہ سمجھا جانے لگا ہے۔ حد یہ ہے کہ میاں بیوی کی باہمی محبت کے بھی معترضین موجود ہیں۔ ان کی دلیل عموماً یہ ہوتی ہے کہ اس طرح کی محبتوں کی بھنک کسی دوسرے کے کان میں پڑتی ہے تو اس کے اندر بھی محبت کرنے کی اکساہٹ پیدا ہوتی ہے اور یوں یہ ''گناہِ کبیرہ'' ہر طرف پھیلنے لگتا ہے اگر چار سو محبت کی حکمرانی ہو تو انسانی مستقبل کے لیے اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو گی لیکن اگر محبت واقعی گناہ ہے تو اس دور کا سب سے بڑا ''گنہگار'' احمد شمیم تھا جس نے اپنی بیوی منیرہ سے کچھ اس طرح ٹوٹ کر محبت کی کہ اس کی دوسری مثالیں بس اکا دکا ہی ہوں گی۔ ظاہر ہے احمد شمیم نے جو خطوط منیرہ کو لکھے وہ اشاعت کے مقصد سے نہیں لکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں وہ بے ساختگی ہے جو بے داغ سچائی اور غیر مشروط پیار کی پیداوار ہوتی ہے۔ احمد شمیم ہمارے دور کا ایک بڑا شاعر تھا۔
>
> مگر منیرہ کے نام اس کے یہ خطوط پڑھ کر ادب کے پرستاروں کو اندازہ ہوگا کہ احمد شمیم ایک بڑا نثر نگار بھی تھا۔ ان خطوط میں اظہار کے کسی تکلف کو روا نہیں رکھا گیا بلکہ شیفتگی کا، سپردگی کا، تنہائیوں کے کرب و اندوہ کا اور ملاپ کی بے کنار تمناؤں کا اتنا کھرا اظہار کیا گیا ہے کہ دل و دماغ کے آفاق پر روشنیاں طلوع ہونے لگتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں احمد شمیم کے خطوط کا یہ مجموعہ محبت کی معصومیت اور

بے لوثی کو عام کرے گا اور اردو کے نثری ادب میں ایک غیر فانی اضافہ ثابت ہوگا۔"(42)

احمد شمیم کے خطوط میں بے تکلفی اور سادگی کے علاوہ القاب و آداب کا تنوع اور ندرت نمایاں ہے۔ کبھی القاب و آداب بالکل چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی لکھتے بھی تو مختصر اور موزوں مثلاً

"منو، شام،
میں کمرے میں تنہا سوچ رہا ہوں،
"ڈھیر ساری شبنم، ڈھیر ساری آگ"
ابھی ابھی تمہارے گھر سے واپس آیا ہوں۔

ایک خط کا آغاز میرا بائی کے گیت سے کرتے ہیں:

جل جل بھئی بھسم کی ڈھیری، آ کے آپ اڑ جاجوگی
چندن کی میں چتا سجاؤں اپنے ہاتھ جلا جاجوگی ۔مت جاجوگی

اسی کا ایک اور ٹکڑا

پریم بھگتی کے پنتھ ہی نیارو
آ کے آپ اڑ جاجوگی

منو! یہ پریم پوجا عجیب ہوتی ہے۔ بھاگت اس سے بے نیاز اور بے پروا ہوتا ہے کہ بھگوان اس کے ساتھ بھی ہیں یا نہیں۔ اس سے خوش بھی ہیں یا نہیں! وہ پوجا کرتا ہے۔ اس کو اسی میں شانتی ملتی ہے۔

جمیل ملک کے نام ایک خط میں یوں مخاطب ہوتے ہیں:

عمر گریزپا سے پیارے جمیل! (۴۳)

احمد شمیم کے خطوط میں ایک بات مشترک اور نمایاں ہے وہ ان کا احساس تنہائی اور فلسفہ موت ہے۔ ان کی تحریروں میں افسردگی، اُداسی اور ایک بے نام سی یاسیت ہمہ وقت طاری نظر آتی ہے جہاں تک میں سمجھتی ہوں ویسے بھی آج کی میکانکی زندگی نے تنہائی کو ہمارا مقدر بنا دیا ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"زخم بے نشاں تم سے جدا ہونے کے بعد میری پہلی نظم تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری پرانی شاعری مصنوعی اور جھوٹی ہے۔ میں نے وہ ساری شاعری پھاڑ دی اور پھینک دی۔ اس کے بعد پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا کہ زخم کھانے کے بعد

انسان کیسے شعر لکھتا ہے۔ لیکن دکھ اور زخم میرے اندر بڑھتے چلے گئے۔ یہی وجہ
ہے کہ مجھے لوگ کہتے ہیں تم وہ شاعری نہیں کرتے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں۔
وہ پھولوں، بادلوں، رنگوں اور محبت کا ذکر کرتے ہیں لیکن تمہارے یہاں ہر چیز
کے اردگرد پُراسرار اندھیرا رہتا ہے اور اس اندھیرے میں دبی دبی سرگوشیاں اور
سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ تمہارے اردگرد محبت بھی ایک اداسی کے کفن کی طرح
لپٹی ہوتی ہے۔''

زندگی ایک عارضی سفر ہے اور ہر مسافر کو ایک نہ ایک دن جانا ہے لیکن کچھ مسافر ایسے ہوتے ہیں جن
کے چلے جانے سے ان کی یادیں اور اندھیرے ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ آج ان کی یاد میں میرے اردگرد
ان کی تحریروں، جملوں، مضمونوں اور کالموں کا ایک انبار ہے، لیکن جانے والا اس وادی سے لوٹ کر نہیں
آتا۔ ہماری کراہیں، آہیں اور نوحہ گری موت کے سامنے بے بس ہیں۔ دکھ کی گھٹاؤں کو ساون کی طرح
برستے رہنا ہے۔

احساسِ تنہائی اور فلسفۂ موت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جھڑی لگی ہوئی ہے۔ بارش کے سرکش آوارہ چھینٹے کمرے میں آ کے اپنا نقش
چھوڑ کے گم ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ میرے دل میں دکھ ہے
اور تم ہو۔ لیکن وہ دکھ بھی تم ہی ہو۔ دل کا ہر زخم تمہاری زبان ہے اور ہر زخم سے
تمہاری ہی ٹیس اٹھتی ہے۔ میں نے تمہیں دل کا کبھی نہ بھرنے والا زخم بنایا ہے
اور اس زخم کی ابدی کسک اور لازوال درد ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ بارش
تیز ہو رہی ہے۔ جمیل ملک کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

پیاس ہے من کو تیرے درشن کی
جی کو جلاتی ہے ہوا ساون کی

بارش کے قطروں سے بلبلے اُٹھتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ اوندھے پیالے پانی پر
رقص کرتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہستی کتنی مختصر ہوتی ہے۔
شاید میر نے اسی لیے کہا تھا:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

انسان کی زندگی بھی کتنی مختصر ہے۔زندگی کے اس سمندر میں وہ حباب کی طرح،
بلبلے کی طرح سطح پر تھوڑی دیر کے لیے نمودار ہوتا ہے اور پھر غائب ہوجاتا ہے۔
اس نمود مختصر کے لیے وہ کیا کیا کرتا ہے۔کیسے وہ سنگین چٹانوں کے ساتھ ٹکراتا
ہے اور پھر بالآخر غائب ہوجاتا ہے۔ہماری ہستی بلبلے کی طرح کتنی مختصر ہے۔
ہماری نمود کتنی عارضی ہے۔اس مختصر نمود میں انسان کیا کیا کرتا ہے۔محبت کے
الاؤ جلاتا ہے تاکہ تیرہ شبوں کو روشن کرے، گناہ،ثواب کے تانے بانے تیار کرتا
ہے۔نفرت اور کدورت کے جہنم بھڑکاتا ہے اور اس سارے کھیل کو زندگی کا نام
دیتا ہے حالانکہ یہ سارا کھیل DeceptionSelf ہے کیونکہ اس کھیل میں
وہ اپنے آپ کو ختم کرتا ہے خدا جانے میں کیا لکھ رہا ہوں۔
موت کا خیال آتا ہے جو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے،کبھی سوچتا ہوں کہ انسان
ساری عمر موت کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور یہی جدوجہد اسے موت کے
قریب تر کردیتی ہے پھر وہ بالآخر عدم کی اس تاریک شب میں ایک موج نامعلوم
بن کے کھو جاتا ہے۔کیا انسان غیر شعوری طور پر موت سے محبت کرتا ہے۔
مجھے یہ حقیقت ایک سچائی نظر آتی ہے کہ انسان واقعی غیر شعوری طور پر موت سے
محبت کرتا ہے۔ہرچند کہ وہ شعوری طور پر موت سے بھاگتا ہے۔
سگمنڈ فرائیڈ کا یہ نظریہ بالکل درست ہے۔انسان کے اندر نفسیاتی اعتبار سے
حیاتیاتی Biological اعتبار سے بھی موت اور زندگی کی برابر چاہت ہوتی
ہے۔موت، عدم کے اس سکوت وسکون کا مظہر ہے جو وجود سے پہلے ایک
ذات غیر محسوس کا حصہ ہوتے ہیں۔وجود انسان سے یہ سکوت وسکون چھین لیتا
ہے۔اس لیے غیر شعوری یا لاشعوری طور پر انسان کے دل میں ہمیشہ موت کی تمنا
رہتی ہے کیونکہ اسی طرح External Rest ابدی سکون ملتا ہے۔شعوری
طور پر وہ موت سے خوف زدہ رہتا ہے لیکن یہ خوف موت سے محبت کی ایک بدلی
ہوئی صورت ہوتی ہے۔"

اپنے ایک خط میں شمیم لکھتے ہیں۔

''مثنوی! ہر لمحہ میرے لیے آج کل عذاب ہے۔عید مجھے جذباتی طور پر تباہ

کر کے رکھ دیتی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے کھولتا ہوا، ابلتا ہوا زہر میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ ایسے لمحوں میں تو مجھے کیوں چھوڑ جاتی ہے۔

منو! انسان بھی کتنا بے بس ہوتا ہے جو اپنے ہی ہاتھوں مجبور ہو۔ کیونکہ وہ خود ہی اپنے لئے زنجیر ہے اور خواہش رہائی کے باوجود وہ رہا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ خود ہونا نہیں چاہتا اور اس کی رہائی کی خواہش میں لذت اسیری کی ہوس ہوتی ہے جو اُسے ہمیشہ زنجیر سے وابستہ کیے رکھتی ہے۔ یوں نہ ہوتا تو میں آٹھ سال تمہارے دکھ کی زنجیر سے کیسے وابستہ ہوتا۔ کیا ایسے نخلستان نہیں آئے جہاں میں اپنے سفر کی انتہا کر سکتا تھا۔ کیا ایسے جزیرے نہیں آئے جہاں میں سمندر کی موجوں کی بلاخیزی سے آزاد ہونے کے لیے روشنی سے سایہ وابستہ ہوتا ہے۔ اپنی مجبوری اور اپنی افتاد طبع کا کیا علاج۔ یہ افتاد طبع جس نے ابھی سے ہی اپنے بے نشان ناخنوں سے دل کے سارے زخم چھیلنے شروع کر دیے ہیں اور اس کی وجہ سے جس روحانی کشمکش کا مجھے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مجھے ہی اندازہ ہے۔

منو! دیکھ اس میں ہر جذباتی آدمی جلتا ہے۔ میں اور تو....... میں اپنے رنگ میں اور تو اپنے انداز سے دراصل منوی! ہر المیہ پسند زندگی Feel کرتا ہے محض گذارتا نہیں، ساری عمر وہ ایک تجربہ کرتا ہے المیہ کو بنیاد بنا کر زندگی گزارنے کا۔ وہ کون سے بات تھی منو، جس نے مجھے ایک دم تیرے قریب کر دیا تھا وہ روح کی کشمکش جو تیرے چہرے پر میں نے کھنڈی ہوئی دیکھی تھی۔ جو اذیت ناک خاموشی بن کے تیرے سارے وجود پر، تیری ساری شخصیت پر چھا گئی ہے جس سے تو کوشش کے باوجود آج تک چھٹکارہ نہیں پا سکی اور نہ کبھی پا سکتی ہے کیونکہ یہی المناک روحانی کشمکش تیری شخصیت کا خوبصورت پہلو ہے جو تجھے عام لڑکیوں سے علیحدہ کرتی ہے۔ کیونکہ اسی المناک کشمکش کی وجہ سے تمہارے اندر وہ تیسری سمت Third Dimension پیدا ہو گئی ہے۔ بول منو! کیا تو اس افتاد طبع یا اس از خود مجبوری سے رہائی پا سکتی ہے۔

اور میں از خود مجبوری کی اس زنجیر ناموس سے کیسے آزاد کر سکتا ہوں اپنے

آپ کو۔

جمیل ملک کے ایک خط میں ناکام حسرتوں، دکھوں، مایوسیوں اور ناکامیوں کا ذکر کرتے ہیں:

جمیل میری جان!

بہت اداس شام ہے، دل پر ایک بے نام بوجھ محسوس کر رہا ہوں جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا ہے۔ زندگی گیلی لکڑی کی آگ کیوں بن گئی ہے۔ کاش ہم لوگ ایک ہی بار بھڑک کر بھسم ہو جاتے۔ قدم قدم پر ناکامیاں، آخر یہ سب ہمیں ہی کیوں دیکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اردگرد زندگی اس شدت سے مہک اٹھتی ہے کہ رو دینے کو جی کرتا ہے اور پھر یہ احساس کہ ہم اپنے ہی دکھوں کے جزیرے میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے اسیر ہیں۔ (۴۴)

ان کے ہاں خوشی کا دن بھی ایک زخم میں بدل جاتا اور ہر خوشی ایک غم چھوڑ جاتی ہے اور تنہائی کی کیفیت جسم سے روح تک پھیل جاتی ہے۔ بقول شیکسپیئر "محبت کرنا اور جدا ہو جانا انسانی دلوں کی اداس کہانی ہے اور یہ اداس کہانی دنیا بھر کی شاعری کا حُسن ہے۔"

چونکہ تنہائی اور جدائی کا دکھ انسان کا مقدر ہے۔ ہر حساس اور ذی شعور انسان معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اکیلا اور تنہا ہے۔ ایسی ہی کیفیت میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "میری اندر کی دنیا کا عکس اس بیرونی دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔ بیرونی دنیا کا اخلاقی نظام جھوٹ، پیسے، مکاری اور فریب پر مبنی ہے اور یہ وہ سنگلاخ چٹانیں ہیں جن کے سامنے میرے خوابوں کے شیش محل کی کوئی حقیقت نہیں۔ میں اپنی اندرونی جنت کو خیرباد کہہ کے اس سرگ کو تیاگ کے کلیتاً سے باہر نہیں آسکتا کیونکہ وہ میری موت ہوگی، میری شخصیت کے تار و پود بکھر جائیں گے اور میری تخلیق کے سارے چشمے سوکھ جائیں گے لیکن باہر کی دنیا ایک ایسی شدید اور اٹل حقیقت ہے جس سے فرار ناممکن ہے۔ باہر کی دنیا مکروہ ہے میں اسے قبول نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ اپنا آپ منواتی ہے۔ اندر کی دنیا حسین ہے اور میرے لیے یہی حقیقت ہے، لیکن دنیا کے نظام میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ نہ میں اس دنیا کا باسی رہ سکتا ہوں نہ اس کا۔ اس کشمکش میں، میں ایک ایسے دکھ میں گرفتار ہو گیا ہوں جو بے اندازہ ہے، دکھ کا یہ بھڑکتا ہوا جہنم ہر ذی الحس اور باشعور انسان کا مقدر ہے۔ وہ اپنی ناآسودگی کے زخم کے ٹیس کو کم کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتا

ہے۔ کبھی اپنے جہنم میں شراب اُنڈیلتا ہے اس خیال سے کہ تنہائی اور محرومی کی آگ کو بجھا سکے گا لیکن اس سے یہ آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے، کبھی وہ اپنے غم میں زندگی کی خوبصورت راہوں پر نکلتا ہے لیکن سفر کے انجام پر اس پر یہ کھل جاتا ہے کہ وہ ایک صحرا میں سے گزر کے آیا ہے۔ آگے ایک اور صحرا شروع ہوگا۔ چنانچہ وہ اس عذاب سے بچنے کے لیے موت کی خواہش کرتا ہے اور یوں اس کے اندر Death Wish یا خواہش مرگ پیدا ہوتی ہے۔ بالآخر ایک دن وہ جسمانی طور پر موت سے ہم آغوش ہو کے اس اذیت اور مسلسل جلتے رہنے کے عذاب سے نجات پاتا ہے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ "منوجی" مجھے بجھنے سے پہلے میری Death Wish کو سمجھو تا کہ تمہیں میری روح میں بھرے ہوئے زہر کا کچھ پتہ چلے۔

لیکن منو! ساری بات یہیں ختم نہیں ہوتی یہ تو خواہش مرگ کا انفرادی پس منظر ہے۔ اس خواہش کا ایک کائناتی یا آفاقی پس منظر بھی ہے اور یہ آگ انفرادی آگ سے زیادہ تیز، زیادہ خطرناک اور جھلسا دینے والی ہے۔ دیکھو! انسان کا سب سے بڑا المیہ اس کی زندگی ہے جس میں احساس اور شعور ہو۔

"انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے فطرت یا خدا آزاد بنا کے چھوڑ دیتا ہے لیکن یہ آزادی ایک دھوکا ہے کیونکہ ہر قدم پر اسے اپنی مجبوری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ فطرت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور اس کی جستجو کا انجام محرومی اور اس کاہش و کاوش کا صلہ ناآسودگی ہوتا ہے۔ خواہش اس کی زنجیریں بن جاتی ہیں اور احساس وہ جہنم جس میں وہ جلتا رہتا ہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تمہارا یہ خط ایک الاؤ ہے جس میں میری روح جل رہی ہے۔ معلوم نہیں منو! میرے پیار میں اور میری خوشی میں غم اور دکھ کا عنصر بنیادی کیوں بن گیا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"مجھے یاد ہے ایک اسلامی تاریخی واقعہ۔ حضرت اویس قرنیؓ نے ساری عمر رسول خدا ﷺ سے محبت کی۔ انہوں نے اپنے سارے دانت توڑ لیے کیونکہ

رسول خدا ﷺ کے جنگِ اُحد میں کافروں کی سنگ باری کی وجہ سے دو دانت شہید ہوئے تھے۔ انہوں نے ساری عمر خربوزہ نہیں کھایا اس لیے کہ انھیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رسولِ خدا ﷺ کس طرح خربوزہ تناول فرماتے تھے۔ میں عشق میں اس انتہا اور شدت کا قائل ہوں۔"

محبت کا رنگ کوئی بھی ہو، محبت انسان کی زندگی کا ایک بے حد لطیف پہلو ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے معاشرے نے اسے ایک المیہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ احمد شمیم کی نظمیں، غزلیں محبت کا ہر رنگ لیے بلند ترین اور پاکیزہ ترین ہیں۔ ان کی شاعری میں ایسی زندہ تڑپ پائی جاتی ہے جو پڑھنے والے کے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر روح میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے اندر تخلیقی اضطراب کی مشعل کو کبھی بجھنے نہ دیا۔

ہوا نامہ بر ہو

تو میں تتلیوں کے پروں پر لکھوں
کبھی ان کہی داستان
سُہانی رُتوں کی ہری دھوپ اوڑھے ہوئے
تیری دہلیز پر بیٹھ جاؤں ___ کہوں
جانِ من
آؤ لمبے سفر پر چلیں
اپنے گھر سے چلیں
آؤ ہم کو بلاتی ہیں اپنی طرف
خواب کی بستیاں!
شام کی بیکراں جھیل میں
سب پرندے اُترنے کو ہیں
آؤ ہم بھی سفر کے لیے
کھول دیں بادبان

☆

تجھ کو خبر کیا ہے درد شام کی تنہائی!
تو جہاں ہے محفل ہے، میں جہاں ہوں تن تنہا!

شمیم نے ان خطوط میں بیشتر جگہ اپنی شاعری کے بارے میں بھی لکھا۔ شاعری کے محرکات پر بحث کی ہے اور کئی نظموں کا پس منظر بیان کیا ہے اور ایک دو خطوط میں اپنی بہت سی ذاتی قسم کی نظموں کی تشریح بھی کی ہے۔ انہوں نے جو اپنی شاعری کے متعلق بحث کی ہے وہ ان نظموں کو سمجھنے کے لیے بہت معاون ثابت ہوگی۔ شمیم جب کوئی نئی نظم کہتے مجھے ضرور سناتے اور اگر میں پاس نہ ہوتی تو خط میں لکھ کر بھیج دیتے ۔ایسی صورت میں نظم کا پورا پس منظر اور اس کی فلسفیانہ توضیح وتشریح بھی کردیتے ۔ایک نظم کا پس منظر اور خلاصہ ملاحظہ فرمایئے۔

''آج میں گیٹ پر کھڑا تھا بس کے انتظار میں، ہوا تیز چل رہی تھی ۔ایک درخت جھوم رہا تھا۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا تم ہو اور تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں ۔ایک دم میرے ذہن میں وہ تصویر اُبھری جس میں تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ ہوا کی طرح تم میرا پیچھا کر رہی ہو اور اب تم درخت بن کے ایستادہ ہو اور کہیں سے تمہارے جسم کی خوشبو کا سیلاب آیا۔ میں گھبرا گیا ____ یہ گھبراہٹ شاعری ہے۔اب مجھے معلوم ہے، میرے لاشعور میں یہ سب باتیں جذب ہو جائیں گی اور کسی دن نظم بن کے نکلیں گی۔ میرے ذہن میں آ گیا ہے!

تم کہاں ہو؟
اس سے تم کون سے صحرا کی جلتی ریت پر
اپنے زخموں کی دکھن سے چور ہو!
آؤ مجھ کو دیکھ لو،
میں تو خوشبو کے سمندر میں
ہزاروں آئینے لے کے کھڑا ہوں
اور یہ پھیلا سمندر
وقت کے ساحل کی ہر زنجیر سے آزاد ہے!
اب بتاؤ اس میں تم کہاں ہو؟ میں کہاں ہوں......اس میں وہ شی کہاں ہے جو بس

کے لیے کھڑا تھا۔ لوگوں کے لیے میں بس کے لیے کھڑا تھا لیکن میں کہاں تھا،
میں تو وقت کی زنجیریں توڑ کے خوشبو کے سمندر میں گم تھا اور ازل سے ابد تک
__ نہیں اس سے پرے تھا۔"
اسی طرح ایک اور نظم کے بارے میں ایک خط میں تفصیل سے لکھتے ہیں:
"منوپ!
رات! گرم اور بے کیف ہے۔ چاند آسمان کے کسی حصے میں چمک رہا ہے۔ میں پہلے خط لکھ چکا ہوں
دن کو __ اس وقت پھر خط لکھ رہا ہوں۔ وجہ! نظم ....

خزاں سے پہلے
چلو کہ ہم برگِ گل کے ماتھے سے
حرفِ ناخواندہ کا تعطر چرا کے لائیں
یہیں کہیں جوئے خوں بھی ہوگی
سلگتے سورج کی بے محابا تپش
سے جھلسا ہوا یہ صحرا
تمہارے بازار و قریہ و شہر سے گزرتا
ہر ایک ذرے کے دل میں نفرت کی تخم ریزی کا دام پھیلائے
بڑھ رہا ہے!
یہ جوئے خوں
تپتی ریگِ صحرا کا رزق بن جائے گی
تو حاصل سوائے افسوس کچھ نہ ہوگا!
کہ حرفِ ناخواندہ کا تعطر بھی
جوئے خوں کی ہی موج بے باک و دل نشیں ہے
خزاں قریں ہے......
چلو کہ ہم......

اس نظم میں، میں نے محسوس کیا ہے کہ خزاں میرے اندر آ رہی ہے اور اس سے
پہلے کہ کوئی بات ہو جائے مجھے اس خوبصورت اور ناخواندہ حرف کی خوشبو کو بچا لینا

چاہیے۔

خزاں سے پہلے مجھے اس حرف ناخواندہ...... تمہارے پیار کو بچانا ہے کیونکہ وہ خون کی نہر ہے جس سے میری زندگی کی خوبصورتی قائم ہے۔اس لیے ہمیں صحرا کو روکنا ہے تا کہ یہ ہماری روح کو بنجر نہ کر دے۔ ہمیں اس جوئے خوں کو تازہ رکھنا ہے۔

میں نے نظم لکھنے سے پہلے یہ محسوس کیا کہ میری شاعری جیسے مر رہی ہے اور میرے اندر صحرا ہے ...... دنیا کا صحرا پھیل رہا ہے۔اس لیے مجھے جوئے خوں یعنی تمہارے پیار کی ضرورت ہے۔

شاعر کے ذہن میں ایک خیال یا تصور پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے اظہار کے لیے عام زبان سے ہٹ کر خاص اور مناسب الفاظ کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کے خیال و تصورات سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں ۔ زندگی کی تمام کرب انگیزیوں اور تلخیوں کو برداشت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں" دنیا میں جتنے بڑے بڑے دکھ ہیں، اتنے بڑے سکھ نہیں ۔ پھر کیوں نہ ایسا سودا کیا جائے کہ دکھ ہی زندگی کا حصہ بن جائیں۔"

شمیم اس دنیاوی زندگی کو وقتی اور عارضی سمجھتے ہیں جبکہ موت ان کے نزدیک ایک اٹل حقیقت اور زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ان کے خیال میں انسان زندگی کے پردے میں لاشعوری طور پر موت سے محبت کرتا ہے۔

ایک مخط جو نظم سے شروع کرتے ہیں:

درد کا ثمر

اے دلِ دردآشنا
خانۂ زنجیر کی خاموش کلفت فزا
جاگتی سڑکوں کے اس شورِ عبث سے کتنی بہتر تھی
کہ جیسے میرے ہی خوابوں کی اک تعبیر ہو!
کون سی دنیا سے اُلجھا ہے

سلگتی شاہراہوں پر یہ پتھر کے خداؤں کا ہجوم!
ہر خدا کے چہرۂ بے حس پہ میرے ہی لہو کا رنگ ہے
پھر بھی سب مجھ سے جدا
یوں اجنبی نظروں سے تکتے ہیں مجھے
جیسے میرے اور ان کے درمیاں
رشتہ کوئی باقی نہیں!
کون سے معبد میں وہ بُت ہے
کہ جس کے خون میں
تیری دھڑکن گھل گئی!
دیکھ اس سیلِ عبث کے شورِ بے مقصد کی ہر موج رواں
تیرے دکھ
تیری صدا سے بے نیاز
کور، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تکتی ہے تجھے
جیسے ناخواندہ کوئی
صفحۂ قرطاس پر پھیلی ہوئی تحریر کو دیکھے
مگر اس دُکھ سے بے گانہ رہے
جو نہاں ہر لفظ کے سینے میں ہے!
اس بھرے بازار میں
ایک ناخواندہ ورق بن کر سلگنا
خواہش اظہارِ غم کی ہے سزا
اے دلِ دردآشنا!

منوی!

"جانِ عزیز! دیکھو تمہارے بغیر کتنا تنہا محسوس کر رہا ہوں اپنے آپ کو۔ بازاروں میں رونق ہے اور ہزاروں لوگ گھوم پھر رہے ہیں لیکن سب مجھے پتھر کے خدا یا بت معلوم ہوتے ہیں، جو میرا درد نہیں جانتے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ماحول کو دیکھ

رہے ہیں اور میری سزا یہ ہے کہ میں ایک کھلی حقیقت ہوں لیکن مجھے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس بھرے بازار سے دور ایک معبد ہے جس میں ایک بت ہے جو ان پتھر کے خداؤں سے مختلف ہے کیونکہ اس کے خون میں میرے دل کی دھڑکن جذب ہوگئی ہے وہی بت مجھے سمجھتا ہے، وہی میرے درد کو جانتا ہے، اس کے لیے میں ناخواندہ ورق نہیں ہوں۔ ایک مقصد، ایک آرزو، ایک حقیقت ہوں، وہی بت میری زبان سمجھتا ہے، میرے دل کی بات سمجھتا ہے، بول منو! یہ بت کون ہے، کیا اب تو خوش نہیں کہ بھرے بازار میں، آدمیوں کے جنگل میں مجھے صرف تو ہی ایک حقیقت نظر آتی ہے جہاں اور لوگ میرا خون اپنے چہرے پر ملتے ہیں وہاں تو نے میری دھڑکنوں کو اپنے خون میں جذب کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ پتھر کے خداؤں سے تو مختلف ہے۔ منوی! یہ نظم آج کے درد کا ثمر ہے۔''

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرے ساتھ آج کل کئی عذاب ہیں۔ کیا کروں نظموں میں شدید Death Wish (خواہش مرگ) ہے۔ آج کی نظم میں بھی ہے، لیکن اس میں زندگی کی ہوس ضرور ہے لیکن اس کا دارومدار تم پر ہے ___ میری ساری نظموں پر موت کا سایہ ہے۔ اگر کہیں خوشی کا پہلو بھی ہے تو اس میں موت شامل ہے۔ پہلے یہ کام آسان تھا کیونکہ میں اکیلا تھا، اب مشکل ہے۔ اب بہت سی زنجیریں توڑ کے مرنا ہے اور ہر زنجیر انسان کے ارادے کو کمزور بناتی ہے۔ سوچتا ہوں اگر میں مر گیا تو تمہارا کیا ہوگا۔''

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دیوانِ غالب تمہارے لیے بھیج رہا ہوں۔ میں نے اشعار پر چھوٹے چھوٹے نوٹ ساتھ لکھ دیے ہیں۔ شاید تم لوگوں کو بتایا جائے کہ غالب رجائی Optimistic شاعر ہے، میں اس کا قائل نہیں۔ غالبؔ نے غم پر جھوٹی ہنسی کا ایک پردہ ڈال دیا ہے لیکن تھوڑی سی محنت اور ذہانت اس پردے کو چاک کرتی ہے اور غم کا زخم نظر آتا ہے۔

میر کے بارے میں بھی تمہیں نوٹس دوں گا۔ بدقسمتی سے میرا Approch

تمہاری استانیوں سے بالکل مختلف ہے اور میں اپنے Angle سے دیکھتا
اور پرکھتا ہوں۔ اس میں لوگوں کے خلاصوں کے دل نہیں۔ میں شعر کو شاعر کی
ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کے آئینے میں دیکھنا پسند کرتا ہوں کیونکہ جبھی اس کی
ساری شخصیت نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے فلسفۂ غم کے بارے میں بہت
سارے اشعار پر نشان لگا دیا ہے۔

غالب کی غزل:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ___

تم غور سے پڑھنا اس غزل کا Psychological Anlysis کرنا آسان
نہیں۔ مجھے اس غزل میں غالب کی شکست خوردگی اور احساسِ شکست کی فریاد
ہمیشہ شدید طور پر اُبھرتی نظر آئی ہے۔ قید و حیات و بند غم میں غالب نے
عمومیت کا رنگ دے کر پوری نوعِ انسانی کا نوحہ لکھا ہے اور پھر جذبے کو مخصوص
کر کے اُسے اپنی ذات پر لایا ہے یعنی غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
...... یہ اپنی ذات کا نوحہ ہے، انفرادی اور اجتماعی نوحے کی یہ کیفیت اور
غزل میں نہیں۔ غالب نے انسان کو بیکسی اور اس کی دکھ بھری زندگی اور بے بسی
کے بعد اپنے اوپر نظر ڈالی ہے اور اپنی بے بسی کو بنیاد بنا کے انسان کی بے بسی کا
رونا رویا ہے۔"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سیکنڈ ائیر میں تھی اور ہمیں کلاس میں غالب پڑھایا جا رہا تھا۔ احمد شمیم
نے مجھے دیوانِ غالب دیا جس پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے نوٹس لکھے تھے اور پھر خطوط میں غالب کے
شعروں کی تشریح کرتے اور مجھے سمجھاتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں:

"خدا کرے تم بہت پڑھ لکھ لو، تو زندگی کا ایسا پہلو تمہیں نظر آئے گا جو انتہائی
تکلیف دہ ہے۔ جہاں انسان کا مقدر کبھی نہ ختم ہونے والا ایک Eternal
Tragedy بن جاتا ہے، پھر خوشی میں بھی ایک دکھ نظر آتا ہے۔ ہنسی کی بنیاد
اشکوں پر اور نغمے کی بنیاد فریاد پر نظر آتی ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"وہ لوگ جو زندگی کا ایک لمحہ حاصل کرنے کے لیے خواہ مخواہ سو سو روگ اپناتے

ہیں۔ان کے لیے غالبؔ نے کہا تھا:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لیکن غالبؔ پر بھی بڑی جلدی یہ راز کھل گیا کہ قید و حیات اور بند غم اصل میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور موت سے پہلے غم سے نجات ناممکن ہے۔آخر زندگی ہے ہی کیا......اک جلتا ہوا صحرا اور پھر کہیں کوئی چشمہ نظر آتا ہے کہاں تک کوئی اس بیکراں صحرا میں چلتا رہے، کہیں سایہ دیوار بھی تو نہیں......اور بقول غالب صحرا میں سر پھوڑنا چاہے بھی تو!

صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

''خدا جانے آج کل غالب اور کافکا کیوں یاد آتے ہیں۔ہر چند کہ دونوں میں کم مماثلت ہے۔غالب نے اپنے زخموں پر ہنسی کی چادر ڈال دی لیکن یہ چادر اتنی باریک ہے کہ غم صاف نظر آتے ہیں۔زخم منہ کھولے دیکھتے رہتے ہیں۔ کافکا نے تاریکی کو تاریک تر پیش کر کے دکھایا اور بالآخر وہ اس تاریکی کا لقمہ بن گیا۔اس نے خودکشی کی __ اس نے وہ ساری زنجیریں توڑ دیں جنہوں نے اس کی روح کو جکڑ لیا تھا۔''

کشمیر اور اس کے حوالے سے خاندان کے افراد اور ان کی جدائی شمیم کی شاعری کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہے۔بہت سے خطوط میں شمیم نے اپنی زندگی کی کہانی کو مختلف حوالوں سے پیش کیا ہے ان خطوں میں ان کے بچپن کی یادیں بھی ہیں اور جوانی کا جوش و ولولہ بھی۔ان میں ان کی شفیق ماں کی تصویر بھی ہے اور چھوٹی بہن کا چہرہ بھی۔وہ اپنی یادوں کے جزیرے میں کھو جاتے ہیں اور پھر جو بھی تصویر سامنے آتی ہے اسے اپنی تحریر میں قید کر دیتے ہیں۔شمیم کے ایسے خطوط جن میں انہوں نے کشمیر کے حوالے سے اپنی زندگی کے متعلق لکھا ہے۔انہیں اگر ترتیب دیا جائے تو پوری سوانح حیات مرتب کی جا سکتی ہے۔

ایک اور جگہ اپنے ان دنوں کی یاد میں جب وہ ایک سٹوڈنٹ لیڈر تھے اور ان کا واسطہ پہلی بار پولیس سے پڑا تھا۔لکھتے ہیں:۔

''ایک دن پولیس کے سپاہیوں کا ہجوم آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔جب

میں نے اردگرد دیکھا تو میں نے اپنے آپ کو جیل میں پایا۔ مجھے صرف اتنا یاد

ہے کہ جب مجھے سپاہی اپنے ساتھ لے جا رہے تھے تو میری بہن کھڑکی سے نم

آلود آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آئیڈیل کو حاصل کرنے کی کوشش میں یہ

زندگی سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ آٹھ فٹ لمبی چار فٹ چوڑی کوٹھڑی میں

میرا دم گھٹنے لگا لیکن جیل والے اس کے ذمہ دار نہ تھے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے

کہ میں نے وہ خوبصورتی جو چند گھروں کی ملکیت ہے اسے سب میں بانٹنے کو کہا

ہے اور یہ جرم ہے اور اس جرم کی پاداش میں مجھے جیل میں لایا گیا۔"

جس جرم کی پاداش میں احمد شمیم کو پہلی مرتبہ جیل جانا پڑا۔ اس ناانصافی کے لیے وہ ساری زندگی لڑتے رہے اور ساری زندگی اسی کشمکش میں بسر کی۔

عمر اسی تضاد میں رزق غبار ہوگئی

آنکھیں تھیں اور خواب تھے، جسم تھا اور عذاب تھے

سیل کی رہگذر ہوئے ہونٹ نہ پھر بھی تر ہوئے

کیسی عجیب پیاس تھی کیسے عجب سراب تھے

یوں تو شمیم کا ہر لمحہ اس عذاب میں گزرا لیکن کبھی کبھی اپنے اکیلے پن اور تنہائی کا احساس بہت شدید ہو جاتا ہے۔ ایسے لمحات میں اپنی تنہائی کا شدت سے اظہار کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

"آج کل جو اپنی حالت ہے وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس ہر لمحہ سنگ گراں ہے

جس کے نیچے دل ہوس رہا ہے اور تو بے خبر!

سری نگر جیل کے وہ سارے کربناک دن اور تڑپا دینے والی راتیں یاد آ رہی ہیں

منو، اس وقت جیل کی چار دیواری کے باہر پُر شور زندگی اپنی سرمستی اور رعنائی

کے ساتھ اپنی روش پر چل رہی ہوتی تھی اور ہم اندر سلاخوں کے پیچھے، اس زندگی

کی نشیلی رفتار کو دیکھ کے اس کے بارے میں سوچ سوچ کے جلتے رہتے، پھر کہیں

سے تھوڑی دیر کے لیے جیل کے صحن کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان کے قطع پر چاند

ایک ذرا سی دیر کے لیے چمکتا ہے ہماری اندھیری کوٹھیوں میں آسیب زدہ سی

روشنی پھیل جاتی۔ پھر ہم ذہن میں ایک تاریخ، ایک دن بٹھا لیتے کہ ہمیں فلاں

تاریخ کو رہا کریں گے، اسی دن کے کھونٹے سے ہماری امید لٹکی رہتی اور ہم کیا کیا قلعے تعمیر کرتے ___ پُرشور زندگی ہمیں اپنی طرف بلاتی۔

لیکن جیل کی اندھی گونگی دیواریں ہمیں آگے کب بڑھنے دیتی تھیں۔ میں نے یہاں آ کے تم سے دوری میں یہی محسوس کیا کہ تو چاند ہے، میں سمندر اور ساحل کی زنجیر میں گرفتار ہوں، تمہاری طرف بڑھتا ہوں تو ساحل کی زنجیر مجھے روکتی ہے۔ تو میری نظم "دوری" پڑھ لو۔ اس میں یہ سارا قصہ تمہیں کنایوں میں ملے گا۔ اس میں جیل کا تجربہ ہے اور پھر تُو ہے، میں ہوں اور دوری ہے۔

تم سے ملے گیارھواں دن ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گیارہ سال کی خلیج تمہارے اور میرے درمیان حائل ہے۔ اپنے ذہن میں تاریخیں مقرر کرتا ہوں۔ ۲۷ گزر گئی اور امید ریت کی دیوار بن کے زمین بوس ہو گئی ہے۔ اب تین تاریخ ذہن میں بٹھا دی ہے۔ کیا معلوم تمہاری کون سی ادا اس امید کو بھی ختم کر دے گی۔ جس طرح جیل میں رہائی کی ایک فرضی تاریخ مقرر کر کے اپنا دکھ سہنے کا طریقہ ڈھونڈتے تھے۔

دُوری

من پاگل ہے
سانجھ سمے سے دیکھ رہا ہے
نیلم نیل آکاش کا چاند
سانجھ سمے سے دیکھ رہا ہے
لہروں کے سینے میں
گھٹتا ___
بڑھتا ___
چاہت کا طوفان
لہریں ساحل سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہیں
جیسے قیدی
زندانوں کی اندھی، گونگی دیواروں سے

ٹکرا جائیں ــــ

راہ نہ پائیں ــــ

لوٹ کے آئیں ــــ

گونگی دیواروں سے باہر

چھیلی چھبیلی مست منوہر

جیون آشا

اُن کو اپنی اور بلائے

من کلپائے!

من پاگل ہے

سانجھ سمے سے دیکھ رہا ہے

سوچ رہا ہے

میں ساگر، تو چاند!

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''زندگی کیا ہوتی ہے ایک زمانہ تھا میں تم سے کہتا تھا'' تلوار کی دھار پر چلنا سیکھو، میرا خیال ہے اب تمہیں پتہ چلا ہوگا کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت فارسی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو از جو

یعنی عمل کے نتیجے سے غافل نہ ہو جاؤ۔ یاد رکھو گندم سے گندم ہی اُگے گی اور جَو سے جَو اُگیں گے۔ یعنی جیسا انسان کا عمل ہوگا ویسا ہی اس کا پھل بھی ملے گا۔ سائنس کے اعتبار سے بھی یہ درست ہے:

Every action has it equal and opposite reaction

یعنی ہر عمل کا برابر اور مخالف ردِّ عمل ہوتا ہے۔ اگر دیوار پر بال ماری جائے تو وہ اسی قوت کے ساتھ مخالف سمت میں لوٹ آتی ہے۔ میں نے زندگی کے بارے میں دیکھا ہے کہ جنت اور جہنم سے انسان کو یہیں دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ہر عمل کا

پھل یہیں ملتا ہے۔

دنیا میں اچھے لوگ سب سے زیادہ دکھ اُٹھاتے ہیں کیونکہ وہ حساس ہوتے ہیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''آسمان دھلا دُھلایا اور صاف ہے۔ اکتوبر کے دن گریباں دریدہ نظر آتے ہیں۔ دھوپ ایک عجیب جان لیوا اداسی بن کے رگوں میں اُتر رہی ہے۔ یہ دن میری زندگی میں ایک عجیب درماندگی اور بے چارگی اور ہمیشہ تنہائی کا احساس اُبھارتے ہیں۔ بہت پہلے یہی دن تھے۔ سری نگر کالج کے کھلے میدان میں بڑے بڑے چناروں کے نیچے بیٹھا کرتے اور سیاست، ادب اور مذہب کی باتیں کرتے۔ پہروں گپ لڑاتے، اس زمانے میں، میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں لائبریری سے کوئی کتاب نکال کے پہروں درختوں کے نیچے بیٹھا پڑھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں زندگی نومبر کے آسمان کی طرح صاف اور بے داغ نظر آیا کرتی تھی، پھر ذہن کے کسی گوشے سے کوئی خواب اُبھرتا اور میں مست ہو جاتا۔ یوں ہی وقت گذرتا رہا۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں، میں نے مہندر ناتھ کی لکھی ہوئی ایک بڑی خوبصورت کہانی پڑھی۔ ''زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہ کہانی میٹھی میٹھی، خواب آور دھوپ کے ساتھ میری رگوں میں، میرے دل میں، میرے خون میں، عجیب اداسی بن کے رچ گئی اور آج تک یہ اُداسی قائم ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا، یہ اداسی میری روح کا اظہار بن جائے گی۔

پھر ایک سال، یہی گریبان چاک دن تھے، میں گھر کی اوپر والی منزل میں تھا۔ پولیس آئی اور مکان کا محاصرہ کیا اور مجھے لے گئی۔ یہ میری دوسری گرفتاری تھی۔ جیل کے صحن میں دن بھر اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے اداس دھوپ کو اپنے اندر جذب کرتا تھا۔ منو، تم سیکنڈ ائیر میں ہو اور ابھی زندگی میں تمہیں کوئی شدید تجربہ نہیں ہوا، میں اس وقت تک دو دفعہ جیل کاٹ چکا تھا۔

میں لوگوں سے مختلف کیوں ہوں؟ اس لیے کہ جب بہت سے لوگ اپنی ماں اور باپ کے سائے میں پل رہے ہوتے ہیں اس وقت میں جیل میں تھا، جس

کوٹھڑی میں تھا اس کے پیچھے میدان تھا جس میں پھانسی کا تختہ تھا۔ میں انتہائی جذباتی آدمی ہوں ___ شروع سے کبھی کبھی میں اس پھانسی کے تختے کو پہروں دیکھتا رہتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے یہ پھانسی کا تختہ میرے اندر آ گیا ہے جیسے تم نے بار بس فلم میں دیکھا۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آج کل یوں پتہ چلتا ہے جیسے سورج سوا نیزے پر اُتر آیا ہو اور محشر کے میدان میں ہوں۔ مجھے اس درجہ غمناک بنانے والے لوگوں میں کون کون شامل ہیں سبھی ہیں اور بڑا مجرم جس کا نام سر فہرست ہے...... میں خود ہوں! میں جس نے اصول اور آدرش، اخلاق اور روحانی اطمینان کا ایک ایسا اُلجھاؤ پیدا کیا ہے جس سے نکل نہیں سکتا۔ یہ انسان کی مرگ مسلسل اور یہ slow death کتنا عذاب ناک ہوتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کے اس دنیا سے آنکھیں بند کر لیں شاید ایک بہتر دنیا کی آرزو میں، میں نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا لیکن یہ دنیا تو ایک حقیقت ہے اور جس نے بھی اس حقیقت سے آنکھیں پھیریں اُسے بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ وہ تنہا جلتا ہے، تنہا جیتا ہے اور پھر ایک دن تنہا مر جاتا ہے۔ اس کے اردگرد سینہ زنوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے لیکن اس کی موت کسی کے اندرون کو نہیں چھوتی۔ وہ ایک ٹوپو کی طرح رہتا ہے دور سمندر میں ساحل سے دور گہرے نیلے پانی میں گھرا ہوا، کوئی نہیں سمجھتا اس کے دل میں، اس کی روح میں، اس کی شخصیت میں کتنا ہیجان ہوتا ہے۔ یہ المناک زندگی ہے۔ کاش! اس زندگی کے عذاب سے بچنے کا کوئی راستہ ہو!

ہر انسان ایک جزیرہ ہے۔ کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ ہم جن کا مقدر یہ ہے کہ دکھ کے صحرا میں خوشی کے پھول اُگاتے اُگاتے اس صحرا میں کھو جاتے ہیں جہاں موت سہارا بن جاتی ہے جس کے خلاف ہم لڑتے ہیں، بھاگتے ہیں بالآخر ہمیں شفیق ماں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور ہم تمام جدوجہد، تمام دکھ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ زندگی ایک بڑی سزا ہے۔ کسی ڈرامے میں ایک کردار دوسرے کردار سے پوچھتا ہے "میں چوری کے جرم میں پکڑا گیا ہوں اور جیل میں ہوں! پیارے ساتھی تمہارا کیا جرم ہے؟"

وہ جواب دیتا ہے ___ "میرا جرم یہ ہے کہ میں پیدا ہوا ہوں۔"

احمد شمیم زمانے کی خود غرضی سے نالاں اور اس کے ہر پل بدلتے ہوئے رویے سے بہت حیران تھے۔ انہیں منافقت سے نفرت تھی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی حق کی خاطر لڑتے ہوئے اور جنگ کرتے ہوئے گزار دی، لیکن کبھی بھی باطل قوتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ جب وہ دنیا کو چڑھتے سورج کی پوجا کرتے دیکھتے تو انہیں بے حد دکھ ہوتا، ایسے میں وہ شدید قسم کی مایوسی اور دکھ کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ دنیا محبت اور صلح و آشتی، جذبوں سے سجی ہو لیکن جب وہ اپنے اردگرد بسنے والے لوگوں کو خود غرضیوں کا لبادہ اوڑھے دیکھتے تو بہت دکھ ہوتا، وہ اس طرز فکر کو کمینگی کا نام دیتے۔

جمیل ملک کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''جمیل! میری زندگی میں جب بھی کوئی گھاؤ پیدا ہوتا ہے یا کوئی خلا پیدا ہوتا ہے تو میں اُسے ہمیشہ تمہاری یاد سے بھرتا ہوں یہ خود غرضی ہے لیکن کیا کیا جائے، تم ہی بتاؤ ___ یا تو تم بھی مجھے ان بے شمار دوستوں کی طرح چھوڑ جاؤ جو کل تک میرے ساتھ تھے اور اب کہیں بھی نہیں۔ ان کے نظریات، عقیدے، فلسفہ، جمیل! یہ کتنا نا قابل یقین المیہ ہے کہ انسان ہزار خوشنما پردوں میں محض اپنی غلاظت اور کمینگی کو چھپانے کے لیے بہروپ بھرتا ہے۔'' (۴۵)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے خطوط سے نہ صرف احمد شمیم کے شب و روز کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے مخصوص خیالات اور نظریات بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سیاست ہے، دین ہے، فلسفہ ہے، انشا ہے، ادب ہے، تاریخ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ہر جگہ طرز تحریر دلکش اور زبان صاف اور پیاری ہے۔ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' شمیم کے دلکش انداز تخاطب نے ان کے مکاتیب میں شان امتیازی پیدا کر دی ہے۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا، محبت کرنے والا، مخلص دوست، خدا سے ڈرنے والا، محب وطن شہری اور بڑے مرتبے کا انسان ہے۔

احمد شمیم کے خطوں میں ان کی طبیعت کی بے باکی اور صاف گوئی موجود ہے۔ وہ بے تکلف اور بے لاگ گفتگو کرتے تھے۔ محبت کا اظہار شدت سے کرتے اور حزم، احتیاط اور مصلحت نام کی کوئی چیز ان کے یہاں نہیں ہے، جو بات دل میں ہوتی اسے وہ بلا رو رعایت کاغذ کے حوالے کر دیتے۔ ان کے خطوں میں ان کے مخصوص خیالات اور نظریات بکھرے ہوئے ہیں مگر خط لکھتے ہوئے اپنے مخاطب کو فراموش نہیں کرتے۔

وفات سے چھ ماہ پہلے کا خط ___ لکھتے ہیں:۔

دسمبر ۱۹۸۲ء

منو،

انتہائی پھیکی صبح ہے۔ تنہائی کے اس عجیب اور تکلیف دہ عالم میں ہوں۔ بیلا، پارو، سامی اور عکسی بہت یاد آتے ہیں۔ تمہارے بغیر زندگی ایک لمبا اکتا دینے والا سفر لگتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے ایک زمانے سے نہیں ملے ہیں۔ اس دن تمہیں اڈے پر چھوڑ کر چلا گیا تو بے حد اداسی کی کیفیت میں سفر گزرا۔ آج کل تنہائی صرف اداس نہیں کرتی بلکہ بیزاری بھی بڑھ گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سزا کاٹ رہا ہوں...... نوکر کا بندوبست کیا ہے وہ دو ایک دن میں آ جائے گا۔

ابا جی اور آپا جی کا کیا حال ہے؟

نظم نہیں ہو رہی اور کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہا ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے نظم بڑی دیر تک پریشان رکھے گی۔ میں واقعی ایک بڑی نظم لکھنا چاہتا ہوں...... اتنی بڑی، جتنی تم ہو ورنہ نظم لکھنا بے کار ہے، بڑی نظم بڑی سزا ہوتی ہے، زبردستی لکھنا نہیں چاہتا...... آپ ہی آپ ہو جائے گی کسی دن ___

آج کل تمہارا کام اور بڑھ گیا ہوگا۔ تین دسمبر کو ضرور آؤں گا اور پھر چند روز ساتھ رہیں گے اور پھر یہی تنہائی ہوگی ___ بے شمار پہلوؤں سے پیار کے ساتھ

تمہارا شمی

پروفیسر جمیل ملک لکھتے ہیں:

''احمد شمیم کے عالم فراق میں لکھے ہوئے یہ خطوط محض علاقائی طور پر ہی خون دل سے نہیں بلکہ حقیقتاً رگ جسم و جاں میں نشتر چبھو کر لکھے گئے ہیں۔ اسی لیے ان خطوط میں جدائی سے وصال تک کے لمحوں کی وہ ساری تڑپ وہ سارا گداز، وہ سارا جمال موجود ہے جس کا سراغ کسی ایسے فنکار کے قلم ہی سے لگایا جا سکتا ہے جس نے واقعی اپنے خون دل میں انگلیاں ڈبولی ہوں۔

احمد شمیم کی آدرش کی تلاش میں نکلیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنیادی آئیڈیل تو اس کی سرزمین وطن اور وہ وادیٔ کشمیر ہی ہے جس کی آزادی کی جدوجہد میں لڑتے لڑتے وہ پاکستان کے محاذ پر آ کھڑا ہوا تھا اور پھر ریڈیو تراڑکھل اور وزارت اطلاعات کے ایک رکن کی حیثیت سے آخری دم تک یہ جنگ لڑتا رہا۔ وہ جنگ آزادی اور حق خودارادیت کی جنگ جو آج بھی زور و شور سے لڑی جا رہی ہے اسے اپنی سرزمین وطن اپنی ماں کی طرح جان سے پیاری تھی جس

میں وہ اپنی دھرتی کے ہی نہیں بلکہ ایک عورت کے روپ میں ماں، بھائی، بہن
محبوب، بیوی، بیٹی، بیٹے بھی کے روپ دیکھتا تھا۔
اس تناظر میں دیکھیں تو منیرہ کے نام احمد شمیم کے لکھے ہوئے خطوط صرف منیرہ
کے نام ہی نہیں بلکہ اس وادیٔ کشمیر کے نام بھی لکھے گئے ہیں جسے اس نے محبوبہ
سے بڑھ کر ماں کی طرح چاہا ہے۔ اگر چہ ماں یا ارض وطن سے مخاطب براہ
راست نہیں مگر منیرہ کے روپ میں احمد شمیم کی ساری کیفیات وہی ہیں جو
مادر وطن سے جدائی کے بعد ایک حساس فنکار کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی
ہیں۔ اس لیے منیرہ سے اس کی جدائی، اس کی ماں سے اس کی جدائی اور وادیٔ
کشمیر سے اس کی دوری کے مترادف بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط میں وہ
تمام محویت، وہ تمام درد و کرب وہ تمام سوز و گداز اور وہ تمام سپردگی دکھائی دیتی
ہے جو عالمِ فراق میں گزاری ہوئی ایک ایک ساعت کا شمار کرتی نظر آتی ہے۔
علامہ اقبال نے کہا تھا۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

احمد شمیم عالم فراق میں اسی لذت طلب کے حصول میں وہ پرندوں کے پروں پر
نظمیں لکھ کر ادھر اپنی وادیٔ کشمیر کے نام بھیجتا رہا اور ادھر ہواؤں کو نامہ بر بنا کر
منیرہ کو اپنے دل کے زخموں کا حساب دیتا رہا۔ اسی لیے منیرہ کے نام یہ خطوط
ایک دو دھاری تلوار کی طرح معلوم ہوتے ہیں جو محبوبہ جاں کے جسم و روح
اور غلامی کی سرحدوں کے آر پار ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس سارے تخلیقی تخیل
میں احمد شمیم کا سراپا لہولہان دکھائی دیتا ہے۔
دراصل احمد شمیم اپنے خطوط میں مکالے اور آدھی ملاقات سے کہیں آگے بڑھ کر
جسم و جاں کا مکمل اتصال چاہتا ہے جہاں خاموشی خود بول اُٹھے اور ایک ایسا
مکالمہ بن جائے جو محبت کرنے والوں کے دلوں میں اُترتا چلا جائے اور طلب و
مطلوب دونوں کو غیر فانی کر دے۔(۳۶)

اگر چہ احمد شمیم کی شاعری انہیں ادب میں ایک اہم مقام دلاتی ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے
انسانیت، انصاف اور مساوات کا درس دیا۔ اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے بہترین انسان جس نے اپنے ضمیر
کی آواز پر ہمیشہ لبیک کہا۔

شاعری کے علاوہ نثر میں خطوط ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں بہت معاون ثابت ہوں گے۔ ان کا سادہ اور بے تکلف انداز، عام فہم زبان، عامیانہ پن ہزاروں میل دور انہیں ایک بہترین نثر نگار ثابت کرتا ہے۔ بعض جگہ تو ان کی شاعری کے صحیح پس منظر کو سمجھنے کے لیے ان خطوط کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جا بجا ان خطوط میں فلسفیانہ خیالات، نزول شعر کی کیفیات اور شعر و ادب کے بارے میں ان کے خیالات بکھرے ہوئے ہیں اور عالمِ فراق میں کہے ہوئے شعر ملتے ہیں۔ مثلاً

آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جائے گی رات
دل میں تُو ہے سامنے چاند کا چہرہ ہے

☆

سایہ ابر گریزاں ہے کہ لیلائے حیات!
کوئی دم ٹھہرے تو ہم پیار کی باتیں کرلیں

زندگی کی شام ہو چکی ہے، آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا سورج ڈھل چکا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو زندگی کی راہوں پر بے شمار روشن چراغ جل رہے ہیں۔ اس حوالے سے خوش قسمت ہوں کہ احمد شمیم جیسا زندگی کا ساتھی تھا۔ زندگی کے بارے میں جو نظریہ اس نے مجھے دیا وہ اچھائی کی دولت میرے طویل سفر کا سہارا بن گئی۔

دکھ بانٹنے والا اور مسکراہٹیں بکھیرنے والا، چمکتے جگنوؤں اور تتلیوں کے ساتھ لمبے سفر پر نکل گیا اور میرے پاس اپنی یادوں کے پھول چھوڑ گیا جو سدا مہکتے رہیں گے۔ میرے پاس میری روح میں اس کی مسکراہٹ کا سونا ہے۔ یہ سب یادیں میرے پاس ہیں۔ انسان فانی ہے مگر اس کا وہ کام فنا نہیں ہوگا جو کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے کیا گیا ہو۔ انہوں نے بیک وقت تین زبانوں میں اپنا تخلیقی اور اصلاحی سفر جاری رکھا۔ فن و ادب کا کون سا شعبہ ہوگا جس میں ان کی خدمات کو فراموش کیا جائے۔

آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی تصنیفات، تخلیقات آنے والی نسلوں تک ان کا پیغام پہنچاتی رہیں گی۔

''ہوا نامہ بر ہے'' احمد شمیم کی نثر میں پہلی کتاب ہے جس میں ۷۵ خطوط شامل ہیں۔ یہ کتاب ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

انتساب ــــ ''کائنات میں محو سفر محبت کرنے والوں کے نام'' ہے
مضمون انگلیاں فگار اپنی۔ پروفیسر جمیل ملک نے لکھا۔
فلیپ، احمد ندیم قاسمی نے لکھا۔
پیش لفظ۔ منیرہ شمیم
اشاعت۔ ۱۹۹۵

احمد شمیم کے مزید پرتو

احمد شمیم بحیثیت صحافی

ہندوستان کے صحافی مولوی محمد باقر جو محمد حسین آزاد کے والد صاحب تھے۔ اپنی حق گوئی کی وجہ سے موت سے ہمکنار ہوئے کہ انہوں نے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مضامین تحریر کیے۔

گویا ہندوستان میں صحافت کا آغاز حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ ہوا۔ پھر مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان جیسے کھرے صحافی برصغیر کی صحافت کو میسر آئے۔ پھر حمید نظامی، مجید لاہوری اور وارث میر جیسے لوگ صحافت کے میدان میں آئے اور حق گوئی کی ایک مثال قائم کی۔ ان حضرات کے علاوہ بہت سارے ادیب اور شاعر بھی صحافت کے میدان میں آئے جن کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

احمد شمیم بھی اخبار سے وابستہ رہے۔ گو اخبار سے ان کا یہ تعلق ہمہ وقتی نہیں تھا بلکہ جز وقتی تھا لیکن شخصیت کے نقوش بہرحال ان کی تحریروں میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ انہیں غریب اور متوسط طبقے سے خاص اُنس اور اپنائیت تھی۔ روزنامہ ''کشمیر'' مظفرآباد اور روزنامہ ''تعمیر'' راولپنڈی میں باقاعدہ لکھتے رہے اور اپنے احساسات و جذبات کو الفاظ کی لڑی میں پروتے رہے۔ روزنامہ ''کشمیر'' مظفرآباد کی ۱۵ مئی ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں آزاد کشمیر کے ملازمین کی تنخواہوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''تنخواہوں کے سلسلے میں آزاد کشمیر میں سب سے زیادہ عجب انگریز پالیسی ہے جو برطانوی نظام نے برصغیر میں رائج کی تھی۔ آزاد کشمیر کے ریاستی ملازمین جو براہ راست آزاد کشمیر حکومت کی منظوری سے متعین کئے جاتے ہیں ان کی تنخواہیں ان ملازمین سے بہت کم ہوتی ہیں جو وزارت امور کشمیر کی طرف سے آزاد کشمیر کے علاقے میں بھیجے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم پر واضح کیا جاتا ہے کہ آزاد کشمیر کی حیثیت ایک غلام علاقے کی سی ہے جہاں تک معیار زندگی اور اخراجات کا تعلق ہے۔ ان میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے کسی حصے میں کوئی

فرق نہیں ہے جن قیمتوں پر پاکستان میں اشیائے خورد ونوش مہیا ہوتی ہے ان
سے کچھ زیادہ ہی قیمتوں پر آزاد کشمیر میں میسر ہیں اس لیے تنخواہوں کا یہ امتیاز نہ
صرف عجب لگتا ہے بلکہ غیر جمہوری بھی ہے۔" (۴۷)

احمد شمیم آزادی رائے پر یقین رکھتے تھے چنانچہ جب یکم جون ۱۹۵۶ء میں آزاد کشمیر میں نگران حکومت کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے لکھا:

"نگران حکومت سے ہم یہ امید رکھتے ہیں جہاں اس نے ریاستی عوام کے حقوق
کا تحفظ کرنے کا عزم کر رکھا ہے وہاں سابقہ حکومت کے وقت کی پریس کی
غصب شدہ آزادی کو بحال کیا جائے گا۔ اخبارات کو اپنا اپنا نظریہ پیش کرنے کی
مکمل آزادی ہونی چاہیے اور منسوخ شدہ ڈیکلریشن جلد از جلد بحال کیے
جائیں۔" (۴۸)

یہی حقیقت پسندی اور حق گوئی انہیں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا گرویدہ بنا دیتی ہے اور وہ ان الفاظ میں قائداعظم کے کردار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

قائداعظم نے واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ نیشنل کانفرنس مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کو بھی دھوکا دے رہی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے نتائج سے بے خوف ہو کے یہ بات کہہ دی۔ دوسرا کوئی سیاست دان ہوتا تو وہ نیشنل کانفرنس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گول مول بات کرتا لیکن قائداعظم کے ترکش میں ایک ہی تیر تھا اور وہ تھا حق گوئی!

۱۹۷۴ء لاہور میں جب دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تو اس وقت کے صدر آزاد کشمیر نے انہیں کشمیر کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرنے کے لیے کہا جو احمد شمیم نے کتابچہ کی صورت میں تیار کی جو بیرونی مندوبین میں تقسیم کی گئیں۔ غرضیکہ احمد شمیم کی پوری زندگی تحریک آزادی کشمیر اور تحریک قیام پاکستان کے لیے وقف تھی۔

احمد شمیم بحیثیت صداکار

بطور صداکار احمد شمیم کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ احمد شمیم نے آزاد کشمیر ریڈیو میں بطور صداکار کام شروع کیا اور آپ ریڈیو سٹیشن کے اولین صداکاروں میں سے ہیں اور ان کی مقبول شخصیت کی بدولت کنٹرول لائن کے آر پار تمام سیاسی شخصیات اور کارکن آپ کو جانتے تھے اور اس کے علاوہ آپ کی صداکاری میں وہ جذبہ بھی شامل تھا جس کو لے کر وہ پاکستان آئے۔ آپ کی صداکاری میں جوش وولولہ

تھا جو بھارتی سامراجیت کے خلاف ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ کے طور پر کام کر رہا تھا لہٰذا وہ بطور صداکار بہت زیادہ مقبول رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ احمد شمیم بنیادی طور پر ایک حریت پسند کشمیری تھے اور پاکستان آمد کا مقصد بھی یہی تھا کہ یہاں رہ کر مؤثر انداز میں کشمیر کی آزادی کے لیے کام کر سکیں۔ ان کے دوست جناب سعید نقشبندی فرماتے ہیں:

"احمد شمیم کو دیہاتی کے روپ میں دیکھا تو پوچھا کہ بھائی یہ بہروپ کیوں بنا رکھا ہے؟ تو کہنے لگے کہ "میں پاکستان جا رہا ہوں اگر تم بھی چلنا چاہتے ہو تو ساتھ چلو"۔ میں نے انکار کر دیا تو ایک دن آزاد کشمیر ریڈیو کی نشریات سنتے سنتے ایک آواز جانی پہچانی لگی بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو احمد شمیم ہے۔ اس بات کے معلوم ہوتے ہی ساری وادی کے نوجوانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ ان کا ساتھی وادی سے باہر جا کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔" (۴۹)

احمد شمیم نے صداکاری صرف اس بنیاد پر کی کہ وہ اپنے وطن اور ہم وطن لوگوں کے زیادہ قریب رہیں۔ اس کے علاوہ احمد شمیم ریڈیو پاکستان راولپنڈی اور آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل میں جز وقتی طور پر کام کرتے رہے۔ ریڈیو پروگرام میرے وطن میں بطور صداکار خود ہی بٹ صاحب کا کردار ادا کرتے اور خود ہی لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ صدائے کشمیر ریڈیو میں ان کی ولولہ انگیز صداکاری یقیناً آج تک لوگ فراموش نہیں کر سکے۔

پاکستان آنے کے فوراً بعد احمد شمیم نے ۴۹-۱۹۴۸ء میں آزاد کشمیر ریڈیو مری میں بطور صداکار کام کیا۔ پھر جب آزاد کشمیر ریڈیو بھی مری سے تراڑکھل منتقل ہو گیا تو وہاں ان کی خدمات اور صلاحیتیں زیادہ بہتر اور نمایاں انداز میں سامنے آئیں۔

۹/ اگست ۱۹۶۵ء صدائے کشمیر ریڈیو نے اعلان کیا کہ بھارت کی قائم کردہ کٹھ پتلی حکومت سے تعاون کرنے والے غداروں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ بولنے والے صداکاروں میں احمد شمیم بھی شامل تھے جو اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس ریڈیو کے لیے رضاکارانہ طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اس ریڈیو یونٹ کے انچارج یوسف ظفر صاحب تھے اور جن لوگوں نے اس کارِ خیر میں رضاکارانہ طور پر حصہ لیا ان میں احمد شمیم کے علاوہ طاؤس بانہالی، میر غلام احمد کشفی اور مجیب الرحمٰن شامل تھے۔

اس ریڈیو نے مجاہدین کے حوصلوں کو زبردست تقویت بخشی اور مجاہدین کے کارناموں کو بھرپور انداز میں بیان و نشر کیا۔ اس کے علاوہ احمد شمیم نے خود بھی ولولہ انگیز تقریریں کیں اور جذبات کو طوفان کا روپ دینے والی نظموں اور غزلوں کو صدائے ریڈیو کشمیر سے پڑھا۔ جوش، ولولہ اور سیاسی بیداری نے کشمیری عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور تمام کشمیری عوام بھی صدائے کشمیر کی آزادی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جدوجہد آزادی میں شریک ہو گئے۔ صدائے کشمیر ریڈیو کی معلومات کی بدولت مجاہدین فتوحات پر

فتوحات حاصل کرنے لگے۔ صدائے کشمیر ریڈیو کی کارکردگی بھارتی حکومت کی بوکھلاہٹ بیان کرتی تھی۔ مقبوضہ کشمیر کے وزیراعظم جی۔ ایم۔ صادق نے اس کے بدلے آزاد کشمیر پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ اس جنگ میں جو بھی فیصلہ ہوا صدائے کشمیر ریڈیو کا کردار ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گا اور جہاں بھی ریڈیو صدائے کشمیر کا ذکر آئے گا وہاں احمد شمیم اور ان کے ساتھیوں کے کارنامے ضرور یاد رکھے جائیں گے۔

احمد شمیم بحیثیت افسانہ نگار

احمد شمیم نے ادب کی تمام اصناف کو آزمایا۔ شاعری، ڈرامہ، افسانہ، تنقید، صحافت وغیرہ۔ یہ ان کا خاصہ ہے کہ جس صنف کو برتا اس میں اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھائے۔ نثر میں خطوط کے علاوہ افسانہ نگاری اور ڈرامے ہیں۔

افسانہ نگاری کو زیادہ وقت نہیں دیا مگر نثر کے میدان میں انہوں نے جو چند ایک افسانے لکھے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ احمد شمیم پرانے دیومالائی طرز کے افسانوں کو نئے اسلوب اور نئے کالم میں ڈھالنا چاہتے تھے اور اس کے لیے شاید انہیں اتنا وقت نہ ملا کہ وہ اپنے اس خیال کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے۔ نثار ناسک بیان کرتے ہیں:

> ''احمد شمیم بہت دکھی رہا۔ ایک طویل عرصے تک والدہ کی موت پر وہ کشمیر کی باتیں کرتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا کہ یہ جتنی بھی علاقائی زبانوں میں داستانیں ہیں ان کی ازسرِنو تفسیر ہونی چاہیے ان کے جو مفہوم بیان کیے گئے ہیں اب تک وہ غلط ہیں، نئے طریقے سے ان کے مفہوم نکالنے چاہئیں۔
>
> میں نے کہا کس طرح؟
>
> ''کہنے لگا یوں سمجھ لو کہ جس کنوئیں میں وہ قید ہے وہ بھارت ہے اور جو سیف الملوک اسے آزاد کرنا چاہتا ہے وہ میں ہوں یا تم ہو۔ اسی طرح جتنی بھی کلاسیکی داستانیں ہیں اس نے نئے مفاہیم اور تفسیریں کیں اور مجھے بتائیں کہ اگر ہم اس طریقے سے ان کی تفسیر کریں تو یہ ایک نیا کام ہوگا۔
>
> یقیناً احمد شمیم کا خیال ایک اچھوتا خیال تھا اور جو بھی فنکار اس طرز کو اپنائے گا یقیناً کامیابی اور شہرت اس کے قدم چومے گی مگر اس کے باوجود اس فنکار کو احمد شمیم کا شکرگزار بھی ہونا ہوگا کہ یہ اچھوتا خیال خالصتاً احمد شمیم کے ذہن کی پیداوار ہے۔'' (۵۰)

احمد شمیم افسانہ نگاری یا کہانی میں حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتے۔ان کے شعری ادب کے ساتھ جب بھی ہم نثری ذوق کا مطالعہ کرتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور حقیقت اور زندگی کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

ان کے افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں

"اور جہلم بہتا رہا" (۱۹۷۳)

دریا تسلسل، روانی اور آزادی کا نام ہے۔دریا ایک مسلسل گیت کا نام ہے۔میں دومیل کے پل پر کھڑا یہ گیت سنتا ہوں۔اس گیت میں میرا ماضی بھی موجیں مارتا، سنائی دیتا ہے۔میرا حال بھی ہے اور مستقبل بھی!__ آنکھیں کھولتا ہوں تو دریا کا آئینہ جھلمل جھلمل کرتا ہے اور مجھے ایک مسلسل کہانی سناتا ہے۔آنکھیں بند کرتا ہوں تو یہ آئینہ میرے اندر لشکارے مارنے لگتا ہے اور اس شکل میں میرے ساری کہانی جھلکنے لگتی ہے۔

میں دومیل کے پل پر کھڑا ہوں۔میرے بائیں جانب مظفر آباد کا پورا شہر پھیلا ہوا ہے۔دائیں جانب چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کے ساتھ ساتھ سڑک کا دوشاخہ ہے۔ایک سری نگر کو جاتی ہے، ایک پنڈی کی طرف۔میں نے آج سے ۲۳ سال پہلے یہ پل پار کیا تھا اور مظفر آباد شہر میں داخل ہوا تھا۔تب یہاں کھنڈر تھے، تنگ گلیاں تھیں، چھوٹے چھوٹے مکانات تھے اور ایک بہت بڑا جذبہ تھا۔اب مظفر آباد پھیل گیا ہے جیسے پوری توانائی سے کوئی سانس لے۔اب مظفر آباد ایک محور ہے، ایک مرکز ہے، زندگی کا مرکزی حصہ ہے، یہاں کالج ہیں، ہسپتال، مدرسے اور سیکر یٹریٹ ہے، اور وہ سب کچھ ہے جس کے لیے بے شمار لفظ استعمال کرنے پڑیں گے اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اب سے ۲۵ سال پہلے یہاں سے ہری سنگھ کا راج ختم ہوا تھا۔

لیکن میں آپ سے مظفر آباد کی بات نہیں کرنا چاہتا۔میں تو دومیل کے پل پر کھڑا موجیں مارتے ہوئے دریائے جہلم کو دیکھ رہا ہوں۔مظفر آباد بھی اسی دریا کی روانی کا ایک حصہ ہے لیکن میں تو دریائے جہلم کی بات کر رہا ہوں جو سری نگر میں میرے گھر کے سامنے سے بہہ کر آتا ہے۔سری نگر میں میرا گھر ہے اور مجھے یاد آتا ہے میں ننگ دھڑنگ دریائے جہلم میں کود پڑتا اور دور کہیں دور بہتے ہوئے کنول پکڑنے کے لیے تیرتا جاتا اور میرے ساتھ بہت سارے ساتھی ہوتے، پھر دریا کے بیچوں بیچ سے کہیں کنارے پر پھرنے والے لوگ عجیب سے، پر اسرار سے، نظر آتے اور مجھے اپنا گھر بھی نظر آتا اور وہ اونچا مکان، وہ دیو قامت حویلی بھی جس کی چھت پر لالے کے پھول کھلے ہوتے۔

ابھی ابھی جو سوچ گذری ہے وہ میرے مکان کا نقشہ لیے میرے سامنے اُبھری ہے اور میرا سارا من اتھل پتھل ہو گیا ہے کیا معلوم اس سوچ میں میری بہن کی محبت کی خوشبو ہو، کوئی خوشبو قید کر سکتا ہے، کوئی دریا کی روانی توڑ سکتا ہے، کوئی پانی کے تسلسل کو ختم کر سکتا ہے۔

کہتے ہیں ایک لکیر ہے جس نے میرے وطن کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے کیوں؟ بھئی پیارے جہلم، میں دریا سے پوچھتا ہوں، وہ ہنس پڑتا ہے، وہ ویسے ہی بہہ رہا ہے وہ اپنی مرضی سے ویری ناگ سے نمودار ہوتا ہے اور پھر سری نگر کے بیچوں بیچ کہکشاں کی طرح گزرتا ہے۔ اپنے شفاف پانی میں، ملاحوں کے گیت جذب کرتا ہوا بہتا ہے، بہے چلے جاتا ہے اور کناروں کو چھوتا ہوا جگہ جگہ کی خوشبو اپنے اندر تحلیل کرتا ہوا یہاں آتا ہے اور پھر یہاں سے آگے نکل جاتا ہے میدانوں کی طرف، پاکستان کی طرف، اے دریا کیا تم پر کوئی روک لگا سکتا ہے، اے دریا کیا تم پر کوئی پابندی لگا سکتا ہے۔ اے دریا کیا تمہارا گیت کوئی ختم کر سکتا ہے۔

دو میل کے پل سے پرے دریائے جہلم نیلم سے گلے ملتا ہے اور پھر دونوں دریا ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور میدانوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ جہلم زعفران کی خوشبو کے گیت سارے پاکستان میں پھیلا دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے آج کل زعفران کھلنے والا ہوگا ___ زعفران خزاں میں کھلتا ہے ___ میرے وطن میں خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں۔ یہ سوچ ابھی اُبھری ہے، اس میں زعفران کی خوشبو تھی کیونکہ یہ دریا پانپور سے بھی گزرتا ہے اور پانپور میں زعفران کے کھیتوں کے دامن سے گزرتا ہے ___ مجھے وہ چاندنی رات نہیں بھولتی جو میں نے پانپور کے زعفران کے کھیتوں میں گزاری ہے۔ وہ رات بھی دریا کی روانی کے ساتھ اپنی خوشبو لیے میدانوں کی طرف نکل گئی ہوگی۔

اور کتنے ہی لمحے، کتنی ہی منور ساعتیں، کتنی ہی معطر گھڑیاں یہاں آکر پاکستان جانے سے پہلے، پاکستان کے حوالے کی ہیں۔ میں یہاں آنے سے پہلے یہاں آچکا ہوں۔ میں پاکستان دیکھنے سے پہلے پاکستان دیکھ چکا ہوں، کیونکہ میں دریا ہوں، میں جہلم کا ایک حصہ ہوں یا جہلم میری شریان ہے جس میں میرا شفاف خون بہہ رہا ہے۔ یہ خون ایک ہی سمت بہتا ہے۔ اس خون کا سفر ایک ہی رخ ہے ___ اور ایک دن انہوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا کیونکہ وہ میرے خون کا رخ بدلنا چاہتے تھے، پھر وہ سمجھے کہ اب خون کا سفر، خوشبو کا سفر رک جائے گا لیکن یہ سفر تو دریا کی کہانی ہے اور دریا تسلسل کا نام ہے، آزادی کا نام ہے۔ اسے اپنی سمت میں بہنے سے کون روک سکتا ہے۔

(احمد شمیم)

طاؤس بانہالی کی کتاب پر پڑھے جانے والے ایک مضمون میں شمیم کہتے ہیں:

"یہ سب گئے دنوں کی باتیں ہیں۔ تیس سال کی خلیج پار کر کے میں ادھر کو نکل جاتا ہوں۔ میں دس بارہ سال کے کچے ذہن والا بچہ ہوں۔ میرے گھر کے صحن میں ایک ڈھیلے ڈھالے کپڑوں والا بے ڈول پیرہن پہنے ایک بابا آتا ہے۔ وہ ایک لمبی تان لگاتا ہے۔ یہ ترار شریف والے شیخ میر دین ولی کے نغمات سناتا ہے۔ امی اس کے تھالے میں چاولوں کا ایک پیالہ ڈالتی ہے۔ پھر بابا دوسرے گھر کے صحن میں تان لگاتا ہے۔

موت شیر ہے اے مورکھ بھاگ کے کہاں جائے گا
وہ تجھے ریوڑ میں سے چن کر نکال لے جائے گا

یہ شیخ میر دین ولی سے میرا پہلا تعارف ہے۔ ایک ازلی اور ابدی حقیقت کے حوالے سے اور موت کے حوالے سے لیکن یہ بعد کی بات ہے کہ مجھ پر سارتر اور کامیو نے پنجے گاڑے جب مجھ پر کھلا کہ حقیقت ایک ہی ہے اور اسی کے حوالے سے زندگی کو دیکھنا اور ماپنا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے گھر سے بھاگ نکلا۔ راستے میں ترار شریف والے شیخ میر دین ولی کی زیارت تھی۔ اداس، چپ چاپ زیارت میں دم بھر کے لیے رکا، دیواریں کہہ رہی تھیں، کہاں بھاگ کر جاؤ گے بھلا اپنے آپ سے کوئی بھاگ سکتا ہے اور کوئی بھاگا ہے آج تک۔

میں نے اس آواز پر سفر کی دھول ڈالی اور آگے چل پڑا۔ اسی زمانے میں ایک اور مورکھ اپنے گھر سے بھاگنے کی دھن میں چلا۔ پہلے اس مورکھ کا نام غلام رسول تھا لیکن وہ جب مجھ سے ملا، طاؤس بانہالی ہو چکا تھا۔ (۵۱)

(احمد شمیم)

احمد شمیم نے ریت پر سفر کا لمحہ میں "اثاثے" کے نام سے ایک مضمون لکھا جس سے اقتباس:

"میری زندگی میں کوئی تسلسل نہیں۔ ساری زندگی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ زندگی کرنے کے اس عمل میں اثاثے بنتے ہی نہیں کیونکہ اثاثے بنانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ڈھلتی دھوپ کی طرح ایک لمحہ

واضح شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی دوسرے لمحے کی اندھی کھوہ میں گر جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں صرف یادیں رہ جاتی ہیں اور یہی اثاثے بن جاتے ہیں۔

میری ہمیشہ تازہ رہنے والے یاد اس ساگ کی خوشبو ہے جو میری والدہ پکاتی تھی۔ اس ساگ کی خوشبو میرے پورے وجود پر محیط ہے اور یہ پل کی طرح مجھے اپنے کٹے ہوئے ماضی سے ملاتی ہے۔ بیچ میں تیس سال کی جدائی کا ایک گونجتا گرجتا دریا ہے۔ جسے میں خوشبو کے لچکتے ہوئے پل پر گذر کر سری نگر پہنچ جاتا ہوں اور پہلے کی طرح ٹھنڈے چاولوں کے ساتھ یہ ساگ کھا لیتا ہوں۔ مجھے یاد ہے جب میں آج سے تیس سال پہلے اپنے گھر سے چلا تو یہ خوشبو میرے پیچھے پیچھے میرے ساتھ روانہ ہوئی اور آج تک میری ہمسفر ہے۔ یہ خوشبو دنیا کے لذیذ ترین کھانے اور میرے درمیان حائل رہتی ہے۔ دس سال پہلے سری نگر میں میری ماں کا انتقال ہوا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اب تک زندہ ہیں کہ وہ خوشبو جو ہجرت کے لئے میرے ساتھ چلی تھی، اب تک میرے ساتھ ہے۔

یادوں کے اس میلے اور اثاثوں کے اس جھنجھٹ میں ایک ستارہ بھی ہے۔ سب ستاروں سے روشن! میں اب بھی اس ستارے کو تلاش کرنے کے لئے تاروں بھرے آسمان میں ڈھونڈتا ہوں لیکن یہ ستارہ کہیں ملتا۔ اس ستارے سے میری ملاقات سری نگر سنٹرل جیل میں ہوئی۔ مجھے تیرہ نمبر کوٹھی میں بند کر دیا گیا تھا۔ قید تنہائی تھی، یہ قید جسم اور ذہن کو دیمک کی طرح چاٹتی ہے۔ ایک شام کو جب سلاخوں والا آہنی دروازہ بند کر دیا تو میں مضمحل کوٹھڑی کے فرش پر دراز ہو گیا۔ رات دھوئیں کی طرح پھیل گئی۔ میں نے بے چینی میں نظر اُٹھائی تو سامنے نظر آنے والے آسمان کے اس ٹکڑے پر ایک ستارہ نظر آیا۔ دیر تک میں اس ستارے کو دیکھتا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر مجھے کچھ پتہ نہیں میں کب سو گیا۔ پھر میں سارا دن اس ستارے کا انتظار کرتا رہتا۔ یہ میرا معمول بن گیا۔ اس ستارے کی رفاقت میں میں نے جیل کی طویل راتیں کاٹیں۔ یہ ستارا مجھ سے باتیں کرتا۔ مجھے تھپکیاں دے کر سُلاتا۔ میں تیس سال سے اس ستارے کی تلاش میں ہوں لیکن مجھے آج تک یہ ستارا نظر نہیں آیا۔ شاید میں آسمان کے نیچے رہ رہا ہوں۔ اس میں ایسے ستارے نہیں ہوتے۔

جس طرح یہ ستارہ میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے اسی طرح جیمز جوائس کا ناول ULYSES میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے اور یہ آنکھ مچولی گذشتہ ۳۰ برس سے جاری ہے۔ یہ ناول میرے لئے ساتویں در کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہ دروازہ گذشتہ تیس سال سے کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں، یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید یہ ناول میری ناتمامی کی ایک علامت ہے۔ شاید یہ ناول..... لیکن بات بڑھانے کا کیا فائدہ۔ ضروری نہیں کہ جو چیز عزیز ہو اس کا تجربہ بھی ہو سکے اور اس کی محبوبیت اس کے اسرار میں ہی پوشیدہ ہو۔ ہاں البتہ HAMELT کی بات ہے۔ میں اس کتاب کے ساتھ گذشتہ تیس

سال سے سفر میں ہوں۔ تنہا بالکل تنہا اپنے ہونے کی اُداس گمبھیر چُپ میں!"

(احمد شمیم : ریت پر سفر کا لمحہ)

ان کے ایک اور مضمون "خوشبو کا نغمہ" کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سری نگر میں کالج میں پڑھتا تھا۔ آپ پوچھیں گے جمیل ملک کا سری نگر سے، میرے لمبے بالوں سے، میری گرفتاری اور روپوشی سے کیا تعلق ہے۔ آخر میں جمیل ملک کے بارے میں کیوں نہیں بات کرتا۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ ان سب باتوں کا جمیل ملک سے ایک عجیب تعلق ہے۔ جی ہاں ___ بہت گہرا تعلق ___ لیکن آپ ابھی میری روپوشی کی بات سنئے۔ جب میں بہت دن بھیس بدلتا، گاؤں گاؤں مارے مارے پھرتا رہا تو ایک دن مجھے بتایا گیا کہ میری ماں میری جدائی میں نیم پاگل ہوگئی ہے۔ میں اس رات بالکل نہ سو سکا۔ صبح میں نے ایک آدمی کے ہاتھ اپنی ماں کو خط بھیجا جس میں اپنی خیریت درج کی اور نیچے اپنا نام لکھا۔ معلوم ہے وہ کیا نام تھا ___ جمیل!! پھر میری ماں مجھے اسی نام سے خط لکھتی رہی اور میں اسی نام سے جواب دیتا رہا۔ یہ جمیل سے میرا پہلا تعارف تھا لیکن ادھورا، کیونکہ اس میں ملک شامل نہیں تھا۔ جمیل میرے اندر سے اُگ آیا تھا اور ملک ایک خارجی حقیقت تھی

(احمد شمیم: خوشبو کا نغمہ)

ان کے ایک اور مضمون "تنگدستی کا سورج سوا نیزے پر اُتر آیا تھا" سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

میں اپنی ذات کے کربلا میں جھلس رہا تھا۔ ہر روز اس خوف میں گزرتا کہ شام غریباں آئے گی، خیمے لٹ جائیں گے اور پھر چاروں کھونٹ راکھ ہی راکھ ہوگی۔ یہ حکومت کے خلاف میرے مقدمے کا دوسرا سال تھا۔ قانون کے تار تار جال میں ملازمت کی سنہری مچھلی پکڑنے کی کوشش میں بے حال ہو چکا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر ایوب مرزا روز شام کو میرے گھر آتا، ہم دیر تک بیٹھے رہتے میں اپنی تنگدستی کو کوڑھ کی طرح چھپانے کے لیے اس پر خالی چائے کا پردہ ڈالتا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا چائے کے ساتھ ساتھ اپنی نثری نظموں کے بارے میں میرے بے تکے مشورے بھی پی لیتے۔ پھر وہ چلے جاتے اور میں پارہ پارہ چاند کو اپنی گٹھڑی میں باندھ کر صبح کا انتظار کرتا ___ جو ابھی تک طلوع ہونے کا نام نہیں لیتی۔

ایک ایسی ہی شام کو ایوب مرزا میرے ہاں آئے۔ "استاد کچھ کام کرو گے ترجمے کا، پے منٹ بھی ہے" وہ بولے،

مجھے ایک دم محسوس ہوا کہ سورج کا ٹمپریچر کئی ہزار ڈگری نیچے آگیا۔ کئی دنوں کی معلق ہوا نے انگڑائی لی اور کمرے کے پردے سرسرانے لگے۔

کریں گے۔ میں نے حامی بھر لی

ڈاکٹر ایوب مرزا نے اپنے بریف کیس میں سے کتاب نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ کتاب

انگریزی میں تھی اور رومانیہ کے عظیم جواں مرگ شاعر...... کی نظموں پر مشتمل تھی۔ میں نے کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ کھول کر ایک نظم کو سونگھا، خوشبو سمجھ میں نہیں آئی۔

استاد بات یہ ہے آپ سے زیادہ بہتر طور پر اس کتاب کا ترجمہ کوئی کر نہیں سکتا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے میری مضمحل انا کو انسولین کا ٹیکہ لگا دیا۔ میں نے ندامت آمیز ہنسی کا لیپ چہرے پر کیا۔!

لیکن بات صاف ہونی چاہیے ایوب مرزا کہنے لگے۔ یہ میری عزت کا مسئلہ ہے۔ میں comited ہوں اور وقت بہت کم ہے۔ منو بھائی بہت سا وقت ضائع کر چکا ہے۔ اُسے یہ کتاب ترجمہ کرنا تھی۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ گویا منو بھائی یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ چکا ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ میں اسے ضرور اٹھا لوں گا۔

اس رات میں نے بیشتر نظمیں پڑھ لیں۔ ترجمے کے لیے قلم اُٹھایا تو ایسے لگا جیسے میں بہتے دریا میں خالی ہاتھوں سے مچھلی پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خیالات گرفت سے نکل جاتے، الفاظ قابو میں نہیں آتے۔ تین دن یہی حالت رہی۔ تیسرے دن میں نے ہمت ہار دی۔ شام کو جب ایوب مرزا میرے ہاں آئے تو میں نے ترجمے کا اتنا معاوضہ طلب کیا کہ ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ دراصل میں جسے سونے کی چڑیا سمجھا تھا وہ تیز پنجوں والا عقاب نکلا۔ صاف بات تھی کہ اس شکار میں لہولہان ہونے کے سارے امکانات تھے۔

ایوب مرزا جب چودہ روشن طبقوں کی چکا چوند سے رہا ہوئے تو چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا ''مٹی پاؤ'' انہوں نے سارے قصے پر مٹی پاتے ہوئے کتاب بریف کیس میں رکھ دی اور چل دیئے۔ معاملہ ختم ہوا۔

لیکن ایک دن پتہ چلا کہ معاملہ ختم نہیں ہوا۔ ہوا یوں کہ ایوب مرزا حسب معمول شام کو آئے۔ آتے ہی کہا۔ ''استاد مضمون کے لیے تیاری کر لو'' __ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد بولے میں نے امنیکو کی نظموں کا ترجمہ کر ہی ڈالا ہے۔

اب مجھ پر چودہ طبق روشن ہونے کی باری تھی۔ سو ہوئے۔ میں حیرت سے ایوب مرزا کا منہ تکنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے یقین آ گیا۔ ایوب مرزا اور سجاد حیدر نے دن دھاڑے سیندھ لگائی تھی اور ہماری آنکھوں کے سامنے لگائی تھی۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا۔ مثلاً اگر ڈاکٹر ایوب مرزا مجھ سے یہ کہے کہ میں نے ایک رات میں ایک ضخیم ناول لکھا ہے تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوگی۔ میرے لیے ڈاکٹر ایوب مرزا اُن ایمان کی حرارت والوں میں شامل ہو چکے ہیں جو شب بھر میں مسجد بنا سکتے ہیں۔

ایوب مرزا کی کتاب پر لکھے ایک مضمون "میں دمے کا مریض ہوں" سے چند اقتباس:

حبس میری جانکنی کا موسم ہوتا ہے

اندھیرے سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ساری رات بتی جلائے رکھتا ہوں۔

ڈاکٹر ایوب مرزا مجھے اپنی پہلوٹی کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" شام کو دے گئے۔ کہا اس پر کچھ لکھنا ہے۔ میں نے اپنے چہرے پر تجربہ کار منافقت کی مسکراہٹ پھیلا دی اور کہا لکھوں گا ضرور لکھوں گا! میرے دل میں چھپا ہوا بزدل چور دھیمی دھیمی مسکراہٹ میں نہار رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا "نہیں لکھو گے، تم کبھی نہیں لکھو گے!"

"لیکن اس وقت میں جو ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب پر مضمون لکھ رہا ہوں تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ڈاکٹر مرزا کی کتاب کا غالب موسم حبس کا اور غالب وقت اندھیرے کا ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ فیض صاحب اپنی شاعری، اپنی جدوجہد اپنی شخصیت اور نظریے کے حوالے سے جس طرح کی ایک علامت بن کر اُبھرتے ہیں اس کا گہرا تعلق حبس اور اندھیرے کی کیفیتوں سے ہے۔"

"ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب سے فیض صاحب کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک اشترا کی سینٹ کی سی ہے۔ اب مجھے نہیں معلوم یہ متضاد اصطلاح آپ کو پسند ہے یا نہیں۔ خود میری یہ کیفیت ہے کہ میرا اور فیض کا رشتہ۔ محبت اور نفرت کا رشتہ۔ ہر چند کہ ڈاکٹر مرزا کی کتاب سے یہ کیفیت بہت کم ہوئی ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ فیض صاحب کے نظریئے میں جو استحکام رہا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ شاعر تو داد و دہش کا بھوکا ہوتا ہے، پر فیض صاحب کی طبیعت میں اس سلسلے میں جو قناعت ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ دنیا سے بے نیاز ہو کر اس دنیا میں رہنا بڑا جہاد کا کام ہے۔

فیض صاحب کے نظریات تو سب پر واضح ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے ایک بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ نظریات فیض صاحب کی زندگی کا کس حد تک ایک جز بن گئے ہیں۔ فیض صاحب نے اپنی موروثی زمین کو کاشتکاروں کے حوالے کر کے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی ذات کی حد تک اُن نظریات پر عمل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہر طبقاتی معاشرے میں درمیانے طبقے کا دانش ور اس سمت کو پھیلانے کے لیے ہر طرح کے پاپڑ بیلتا ہے۔

فیض صاحب کی شخصیت واضح طور پر ایک ایسے سائیں کی سی اُبھرتی ہے جو کسی صورت Property minded نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ فیض صاحب کا موروثی زمین سے دستبردار ہونے کا واقعہ ٹالسٹائی کے واقعات کی طرح عالمگیر واقعہ نہ بن سکا۔ شاید اس لیے کہ فیض صاحب دوسروں کی زمین کے ساتھ یہی عمل چاہتے ہیں اور وہ دوسرے ایسے شخص کو ہیرو بنا کر اپنے لیے عذاب

نہیں پیدا کرنا چاہتے۔ان لوگوں کو ایک روحانی ہیرو کی تلاش رہتی ہے جو ان کے مفادات پر ضرب نہ لگا سکے۔فیض صاحب کا معاملہ کچھ مختلف ہے وہ کسی صورت رومانی ہیرو نہیں، انہوں نے عنفوان شباب میں مارکس کا مطالعہ کیا ہے اور موچی دروازے تک بھی گئے۔آ گہی کا عذاب کاٹنے جیل بھی گئے ہیں اور ہمارے یہاں کے صالح روایت پسندوں کو جب بھی موقع ملے فیض صاحب پر ایک آدھ تہمت کا اضافہ کر کے ثواب کماتے ہیں۔"

جانے ڈاکٹر صاحب کی کتاب پر مضمون لکھتے لکھتے میں کہاں نکل گیا ہوں۔دراصل میں مریض ہوں دل کا۔اور دمے کا بھی دل کے عارضے کے ساتھ تعلق ہے۔حبس میری جانکنی کا موسم ہوتا ہے اور ڈاکٹر مرزا کی کتاب کا بھی موسم ہے حبس اور اندھیرے کا__!

ہم اندھیرے میں شدت کی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔غنیمت ہے کہ اس حبس اور اندھیرے میں کوئی جگنو چمکتا ہے _ فیض _ اور اس جگنو کی تلاش میں کوئی ڈاکٹر ایوب مرزا نکلتا ہے۔

(میں دمے کا مریض ہوں:احمد شمیم)

احمد شمیم بحیثیت ڈرامہ نگار

احمد شمیم نے ادب میں شاعری، افسانہ، تنقید، مضامین اور خطوط کے علاوہ نثر میں جو دوسرا بڑا کارنامہ کیا وہ ان کے ڈرامے ہیں جو انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھے۔جہاں وہ ایک اچھے شاعر تھے وہاں وہ منفرد اسلوب کے حامل ڈرامہ نگار بھی تھے۔اس بات کا ثبوت ان کا ڈرامہ "ریت پر سفر" جس نے 1975 میں ہونے والے ڈرامہ فیسٹول میں ایوارڈ حاصل کیا۔

ڈرامہ جس قدر زندگی کے قریب ہوگا اسی قدر اس کی مقصدیت پوری ہوگی۔اس کے علاوہ ڈرامے کی کامیابی کے لیے مکالمے بھی جاندار اور پُر اثر ہوں تو چھوٹے چھوٹے مناظر بھی ڈرامے کے ٹیمپو کو تیز اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

احمد شمیم کا یہ کمال ہے کہ ایک جدید شاعر ہونے کے باوجود ان کے ڈراموں میں سادہ اور روزمرہ کی زبان ملتی ہے۔بلاشبہ شعری لغت میں انہوں نے بہت اجتہاد سے کام لیا لیکن وہ نہ صرف پورا لسانی شعور رکھتے تھے بلکہ اسے برتنے پر بھی قادر تھے اور اس بات کا ثبوت ان کے مکالمے ہیں جو سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ناظر کو متاثر کرنے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں۔

احمد شمیم کے ڈرامے "ریت پر سفر" نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ڈرامے کی کہانی ہمارے معاشرے کی کہانی ہے۔مرکزی کرداروں میں ایک لڑکا (ارشد) ہے جو ایک غریب گھرانے سے تعلق

رکھتا ہے وہ ایک لڑکی (تنزیل) سے محبت کرتا ہے لیکن وہ لڑکی بہت امیر خاندان کی ہے دونوں کی شادی نہیں ہو پاتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ بڑی وجہ ان کے درمیان طبقاتی فرق ہے۔ سماجی حیثیت میں تفاوت انہیں دور کر دیتا ہے۔ کہانی میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس موضوع پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن بیان کرنے کا انداز بھی اشیاء اور واقعات کو نئی صورت بخش دیتا ہے۔ ڈرامے کے آغاز، کلائمکس اور اختتام تک احمد شمیم نے بڑی مہارت اور فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ مکالمے نپے تلے اور ادائیگی خوبصورت معاشرے کے مختلف کرداروں اور ان کے خیالات کو پیش کرنے میں احمد شمیم کا جواب نہیں۔ مثلاً ایک منظر میں ایک کردار راحیل دوسرے کردار ارشد کو آئینہ دکھاتے ہوئے کہتا ہے۔

ارشد: پلیز راحیل اگر تم مدد نہیں کر سکتے تو پریشان مت کرو۔

راحیل: ارے بے وقوف میں اپنا مختصر رول ادا کر رہا ہوں، جس طرح تم نے ماسک پہنا تھا میں نے بھی ایک ماسک پہنا ہے۔ ارسطو کا، سقراط کا ....

کبھی تم نے میرے اندر دیکھا ہے...... میں ایک چھوٹا، بہت چھوٹا آدمی ہوں اور میں اپنے چھوٹے پن کو چھپانے کے لیے بڑے بڑے چہرے پہن لیتا ہوں۔ ارسطو کا چہرہ، سقراط کا چہرہ، سارتر کا چہرہ اور تم اپنے آپ کو چھپانے کے لیے بڑے جاگیردار کا چہرہ پہنتے ہو، ہل اونر کا چہرہ پہنتے ہو لیکن میرا کھیل آسان ہے اس پر کوئی خرچہ نہیں آتا تمہارا کھیل مشکل ہے تمہارے ماسک کے ساتھ کار کی ضرورت ہوتی ہے، پیسے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ماسک تڑخ جاتا ہے اور دیکھو تڑخ گیا تو Eternal Cousin نے ایک گھونسے میں چکنا چور کر دیا۔ کار کے خواب، کوٹھی کے خواب اور اس گڈ لائف سے نکلنے کے خواب......

احمد شمیم نے ریڈیو کے لیے بھی متعدد ڈرامے لکھے جن میں "ایک ندی دو کنارے"، "گھر کا راستہ بھول گیا"، "لمحہ جوابدہ نہیں" وغیرہ شامل ہیں۔ ان ڈراموں کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ احمد شمیم کا موضوع زیادہ تر کشمیر اور اس سے متعلق یادوں کا بیان رہا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ریڈیو تراڑکھل سے وابستہ تھے اور جانتے تھے کہ یہ نشریات کنٹرول لائن کی دوسری طرف بھی سنی جاتی ہیں اور وہ اپنے لوگوں سے اسی ذریعے سے مخاطب ہو سکتے ہیں۔ اس لیے لاشعوری یا شعوری طور پر ان کے ڈراموں کے موضوعات پر کشمیر حاوی رہا۔ ریڈیو کا ڈرامہ "ایک ندی دو کنارے" میں کشمیر کی تقسیم اور اس کے اثرات کا ذکر ملتا ہے کہ جب جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے انسانوں کے درمیان سرحدیں حائل ہو جائیں تو انسان ذہنی کرب کا شکار ہو جاتا ہے اور شاید یہ وہی کرب تھا جس نے ساری زندگی احمد شمیم کا پیچھا نہ چھوڑا۔

احمد شمیم فن ڈرامہ نگاری سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اسی لیے ان کے ڈرامے موضوع کے علاوہ ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں جو کسی کامیاب ڈرامے کا خاصہ ہیں۔

عابد علی عابد لکھتے ہیں:

عام طور پر ڈرامے کے پلاٹ یا ماجرا طرازی کا جو نقشہ بنایا جاتا ہے اس کی ورت یہ تفصیل ذیل ہوتی ہے:

''نمبرا۔ نقطۂ آغاز ہے یعنی کشمکش کا تعارف جب کردار ہم سے روشناس کرائے جاتے ہیں۔

نمبر۲۔ تعارف کا اختتام، کشمکش کے بہت سے حل نکلتے ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ مصنف کون سا راستہ اختیار کرے گا۔ پھر کشمکش کا اختتام سامنے آتا ہے، الجھنیں رفع ہو رہی ہیں، مسائل سمیٹے جا رہے ہیں ۔کہانی کے انجام کی صورت میں انجام کا آغاز ہوتا ہے۔''(۵۲)

احمد شمیم کے ڈراموں کو اگر اس نقشے کی روشنی میں پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام ڈراموں میں بنیادی تکنیک کا نہ صرف دھیان رکھا گیا ہے بلکہ اسے بڑی کامیابی سے برتا بھی گیا ہے۔ آغاز کرداروں کا تعارف، کشمکش اور پھر الجھنوں کا رفع ہونا اور اس کے بعد انجام کا آغاز نہایت خوبصورت طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

احمد شمیم نے منظوم کھیل بھی تحریر کیے اور ان میں بھی اسی معیار کو برقرار رکھا۔ ان کے منظوم کھیل میں زبان بالکل سادہ ہے، مشکل پسندی کا دور دور تک ذکر نہیں۔ عام فہم الفاظ کو نہایت سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔

احمد شمیم کے منظوم کھیل ''گھر کا راستہ بھول گیا'' کی چند لائنیں درج ذیل ہیں:

بیٹا: جان میری وہ موج مضطر ہے
جو وصالِ کنارِ دریا سے بیشتر ہی
سکوتِ قلزم میں کھو گئی ہو......!
...... میری تمنا نڈھال ہے
اس شریر طفلِ ناداں کی طرح
جو چاند کی لگن میں
بلک بلک کے

کسی دریچے میں سو گیا ہو!
اداس کھڑکی کی گود میں مضمحل تمنا
بلکتا بچہ
جو جان جان ہی نہ ہو
در آئی تھی دل کے گلشن میں
چپکے چپکے
جو بادِ صبح بہار بن کر

احمد شمیم کے بھی ڈرامے نہایت عمدہ قرار پاتے ہیں ۔ اپنے کھیلوں میں کردار کا تعارف، کشمکش اور انجام نہایت خوبصورت اور پُر اثر انداز میں کرتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے چونکہ احمد شمیم آزاد کشمیر کی انقلابی تحریک سے وابستہ تھے اور عملی طور پر جدوجہد کرنے کا تجربہ رکھتے تھے اس لیے اُن کے کردار اور ان کی درمیانی کشمکش بڑی حقیقی اور زندگی کے قریب لگتی ہے ۔ احمد شمیم بنیادی طور پر عملی آدمی تھے ۔ ان کے نزدیک محض گفتگو کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے وہ جدوجہد پر ایمان رکھتے تھے اور ان کی پوری زندگی اس کی گواہ ہے ایسا انسان جب کوئی تخلیقی کام کرتا ہے تو لازمی امر ہے کہ اس کے تخلیق کردہ کردار باتیں کم اور کام زیادہ کرتے ہیں ویسے بھی ڈرامے میں یہ بات کہنے سے زیادہ کرنے میں تعلق رکھتی ہے۔

احمد شمیم کا یہ کمال ہے کہ ایک جدید شاعر ہونے کے باوجود ان کے ڈراموں میں سادہ اور روزمرہ کی زبان ملتی ہے۔

ایسے ہی الفاظ شمیم کے ایک ڈرامہ "درِ زنداں کھلتا ہے" کا کردار ندیم بولتا ہے۔

ندیم: بہت سارے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی دوٹوک جواب نہیں ہوتا مثلاً اگر تم مجھ سے پوچھو کہ میں میک اَپ کر کے کیوں نکلتا ہوں تو میں یہ بھی جواب دے سکتا ہوں کہ جو لوگ اپنی صورتوں کو دوسری آنکھ کے آئینے میں دیکھنے سے ڈرتے ہیں وہ میک اَپ کا نقاب پہن کر نہ پھریں تو کیا کریں۔

احمد شمیم کے نمائندہ ڈراموں میں ایک اور نمائندہ ڈرامہ "لمحہ بہ لمحہ" ہے ۔ اس ڈرامے میں شمیم نے اپنی زندگی کو دہرایا ہے ۔ اس کی کہانی ماں اور ممتا کے گرد گھومتی ہے ۔ ماں کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ برداشت کر لیتی ہے لیکن اولاد کی دوری برداشت نہیں کر سکتی ۔ شمیم نے ایک

ماں کے کردار کو پیش کیا ہے۔جس کا بیٹا اس سے دور ہو جاتا ہے لیکن ممتا بھرا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔اُسے اپنے بیٹے سے ملنے کی آس لگی رہتی ہے۔یہ ایک ماں کے جذبات کی بہترین تصویر کشی ہے۔

احمد شمیم خود بھی اپنی ماں سے بچھڑے ہوئے تھے اور ماں کی جدائی ان کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔یہ دکھ ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے اور اس کی عکاسی انہوں نے اس ڈرامے میں بھی کی ہے اور اگر اسے وسیع کینوس پر دیکھا جائے تو یہ ہر اس شخص کی کہانی ہے جو اپنی حقیقی ماں سے اپنی دھرتی ماں سے دور ہے اور واپس جانے کے لیے بے چین ہے۔

اگر وہ ڈرامہ نگاری پر توجہ دیتے تو وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اس میدان میں آزماتے۔ایک مایہ ناز ڈرامہ نگار ہوتے۔غرض ڈرامہ نگاری کے میدان میں جتنا بھی کام چھوڑا وہ قابلِ قدر ہے۔

مندرجہ بالا ڈراموں کے علاوہ احمد شمیم نے ریڈیو کے لیے اور بھی بہت ڈرامے اور پروگرام لکھے۔ان پروگراموں میں کشمیری ڈرامہ 'بدشاہ'، 'جہانگیر' اور کشمیر، ڈرامہ 'ڈھول کا پول'، شیخ عبداللہ جنت کے دروازے پر، 'میرے وطن'، 'مہاجرین اور مکتہ ہار کے علاوہ 'خط کہانی' کے عنوان سے ایک سیریل بھی لکھی۔علاوہ ازیں چاچا نہرو کے نام کھلا خط کشمیر بنام سورن سنگھ آپ کے نہایت مقبول پروگرام تھے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے یہ چند ڈرامے کسی حد تک ہمیں احمد شمیم کی ڈرامہ نگاری کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ان کی کہانی، مکالمے، پلاٹ، کردار نگاری، اُتار چڑھاؤ، آغاز وانجام میں منطقی رابطہ اور مہارت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ان کا خالق ایک باشعور اور ذہین فنکار ہے۔ٹیلی وژن ڈراموں میں 'پہاڑسی زندگی' سیپ، ساحل سمندر، لمحہ بہ لمحہ، ریت پر سفر نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

احمد شمیم نے خطوط اور ڈراموں کے علاوہ نثر میں مضامین اور اداریے بھی لکھے۔اس کے علاوہ افسانہ نگاری بھی کی۔انہوں نے چیخوف، گورکی اور ٹالسٹائی وغیرہ کی تحریروں کے ترجمے بھی کیے۔افسانہ نگاری پر اتنی توجہ نہ دی تاہم ان کے خطوط دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ افسانہ لکھتے تو کوئی شبہ نہیں کہ بہت سا قابلِ قدر سرمایہ چھوڑ جاتے۔

احمد شمیم ایک پرگو شاعر وادیب تھے۔انہوں نے جس صنف کو بھی برتا خوب برتا۔انہیں الفاظ کے استعمال کا سلیقہ آتا ہے اور بات کہنے کا فن جانتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ ہو یا افسانہ، مضمون ہو یا ان کا ذاتی خط ہر جگہ ان کا خوبصورت، شائستہ وشستہ اسلوب نمایاں ہے۔ان کی نثر میں ایک بہاؤ اور روانی ہے۔ثقیل الفاظ، بھاری تراکیب نہیں ہیں بلکہ اس کی بجائے اظہار مدعا پر زور دیا ہے۔اس لیے ان کی نثر قبولِ عام کا درجہ رکھتی ہے۔

ناقدین کی آرا

احمد شمیم نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز جن احباب میں گزارے، ان میں سے چند دوستوں کی رائے .... وہ دوست جو نہ صرف ان کے قریب رہے بلکہ ادبی اور تخلیقی زندگی میں بھی ان کے ہم سفر رہے ۔وہ کیا کہتے ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم

احمد شمیم کے بارے میں ان کے دوست آفتاب اقبال شمیم بیان کرتے ہیں:

''احمد شمیم کی اور میری نظریاتی دوستی تھی ۔وہ مجھ سے چار سال بڑے تھے ۔اس وقت وہ آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کرتے تھے ان سے مل کر انکشاف ہوا کہ ہم دونوں شاعر ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں نے مل کر ایک تجربہ کیا جو انتہائی کامیاب رہا۔ وہ تجربہ یہ تھا کہ ہم دونوں مل کر ایک غزل کہتے تھے ۔یعنی چند اشعار احمد شمیم کے اور چند اشعار میں کہتا تھا۔ اس طرح یہ غزل، ایک غزل دو شاعر کے عنوان سے اخبار میں چھپتی اور نقاد حضرات کو ہم یہ غزل روزنامہ تعمیر کے ذریعے فراہم کرتے اور ان کے تبصروں سے ظاہر ہوا کہ ہمارا یہ تجربہ کامیاب رہا۔ احمد شمیم ادب، سیاست اور فلسفہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔''

''احمد شمیم کی شاعری ہمارے دور کے طرز احساس کا مثالی نمونہ ہے۔ زمانے کے اضافی حوالوں سے ہمارے دور کی جہتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ وجودی سطح پر انسانی شعور کی بلندی اور انسانی جبلت کی گہرائی کو ناپتی ہے اور تاریخی حوالے سے خیر و شر کی جنگوں میں انسان کی مسلسل ہزیمت اور اس ہزیمت کو نہ ماننے کے لیے انسانی رویے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''

احمد شمیم کی نظم اردو نظم کی روایت کے تسلسل کی نئی کڑی ہے۔ تمام نظمیں جس میں وہ ذات و کائنات کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے زمانی اور وجودی مسئلوں کی تشخیص کر رہا ہے۔ وہ مسئلے جو انسانوں کے گرد اور انسانوں کے اندر عمودی چٹانوں کی طرح کھڑے ہیں۔

(ھمیں ماتھے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

پروفیسر سرور کامران

پروفیسر سرور کامران احمد شمیم کے بارے میں کہتے ہیں:
''احمد شمیم ذاتی زندگی اور گفتگو میں ایک کھرا اور واضح آدمی تھا۔''

(ھمیں ماتھے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

ڈاکٹر غلام حسین اظہر احمد شمیم کے بارے میں کہتے ہیں:
''احمد شمیم کی شخصیت اور فن کے بارے میں، میں نے جب بھی سوچا ہے تو مجھے اس کے یہاں اپنی ذات ہی کی شکست سنائی نہیں دی بلکہ مجھے اہلِ کشمیر کی تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی زندگی کا وہ آئینہ دکھائی دیا جس میں ہم سب اپنے ریزہ ریزہ خوابوں کی کرچیاں بکھری ہوئی دیکھ سکتے ہیں۔

(روز نامہ تعمیر)

احمد ظفر

احمد شمیم اوریجنل شاعر تھا اور بہت بڑا شاعر تھا۔ اُسے ہجرت راس نہیں آئی۔
ہجرت اُسے کھا گئی۔

(روز نامہ جنگ)

رشید نثار

''ادب کا نیا تصور احمد شمیم کا اپنا آدرش تھا۔ اس لیے ''زید'' ایک فرد ہی نہیں، ایک نئی نسل کے مترادف تھا۔ نئی نسل ماضی کو حال سے بہتر نہیں سمجھتی۔ وہ مستقبل کے خوش آئند تصور کو بھی اتنی حیثیت نہیں دیتی اور ''حال'' کی قیمت پر مستقبل کا سودا نہیں کرتی۔ لہٰذا نئی نسل کے لیے ''حال'' کی اجتماعیت ترقی اور زندگی کی دائمی قدر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ احمد شمیم نے نئی نسل کے 'زید' کو غیر متناہی ارتقاء کی طرف لانے کے لیے اُسے اپنا ہمزاد قرار دے کر یہ کہا تھا کہ جب تک گدلے پانی میں عکس پیدا نہیں ہوگا۔ چشمہ شعور میں آئینہ گری پیدا نہیں ہوگی۔''

(روز نامہ جنگ)

اعجاز راهی

''۱۹۷۰ء کی بات ہے، ہم چار دوست نثار ناسک، اختر امام رضوی، جناب احمد شمیم اور میں ایک ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے لیے بیٹھے تو ایک شخص کیفے میں داخل ہوا تو اختر امام رضوی نے اس شخص کو دیکھتے ہی کہا، یہ شخص بہت جینئس ہے، اسی دوران ایک اور آدمی اندر داخل ہوا تو اس کے بارے میں بھی اختر امام نے یہی الفاظ استعمال کیے اور اس کے بعد ایک اور شخص آیا تو اس کے بارے میں بھی اختر امام نے یہی الفاظ استعمال کیے۔ اس پر احمد شمیم بولے کہ اختر امام میں تجھے غلط نہیں کہوں گا۔ تم بہت اچھے آدمی ہو کہ تم نے ایک منٹ میں تین جینئس پیدا کر دیے۔''

(همیں ماتھے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

نسیم الحق شمیم

''ایک مرتبہ احمد شمیم نے اپنے بیٹے عکسی کی سالگرہ میں شرکت کی دعوت دی۔ ہم نے سوچا خوب زبردست قسم کا پروگرام ہوگا لہٰذا کوٹ پتلون پہن کر ٹائی لگا کر احمد شمیم کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مہمانوں کو زمین پر قالین بچھا کر بٹھایا جائے گا اور قرآن خوانی ہوگی۔ میں نے پہلی مرتبہ احمد شمیم کا یہ روپ دیکھا تھا۔ لہٰذا میں نے پوچھا یہ کیسا پروگرام ہے، میں تو سمجھا تھا کہ مغربی انداز کی دعوت ہوگی لہٰذا کوٹ پتلون پہن کر آیا ہوں اور یہاں تو 'قرآن مجید کا ختم' منعقد ہو رہا ہے۔ یہ کیا تبدیلی ہے تمہاری شخصیت میں، تو احمد شمیم ہنس کر بولے کہ یار میرا ایک ہی تو بیٹا ہے تو اس کی سالگرہ میں قرآن خوانی ہو جائے تو بہت اچھا ہے لہٰذا میں نے قرآن خوانی کا بھی انتظام کر لیا۔ احمد شمیم دولت سے بے نیاز، درویش صفت انسان تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب ناظم اطلاعات آزاد کشمیر مقرر ہوئے تو انہوں نے اپنے دفتر میں گھنٹی لگانے کی اجازت نہ دی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کسی ماتحت کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے، ان کی نظر میں عہدہ کوئی چیز نہ تھا۔''

(روز نامہ جنگ)

نثار ناسک

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ راولپنڈی میں ریڈیو پاکستان راولپنڈی نمبر ۳ کے سامنے پشاور روڈ پر پتھر کی چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ احمد شمیم وہاں ایک پتھر کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اکیلا، دوپہر کا وقت،

میں بڑا حیران ہوا۔

میں نے کہا، دفتر نہیں گئے! کیا بات ہے؟

بس یونہی بیٹھ گیا ہوں!

میں نے پوچھا، کیوں کام نہیں ہے؟

پھر کہنے لگا بس یونہی!

میں نے کہا کوئی تو بات ہوگی، کہنے لگا، میری ماں مرگئی ہے اور وہ کشمیر میں تھی، جہاں میں نہیں جا سکتا اور میں یہاں کسی کے گلے لگ کر رو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ تو میں نے سوچا کچھ دیر میں یہاں اکیلا بیٹھ جاتا ہوں۔

یہ واقعہ مجھے ایک طویل عرصے تک بہت دکھ دیتا رہا کہ ایک ایسا شخص جو ایک نئے وطن کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر آیا تھا وہ ٹھیک طریقے سے اپنی ماں کی تعزیت بھی نہیں کر سکا۔

میں بھی رونا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے بھی احمد شمیم کی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ میں کیا کہتا۔ اُسے کون سی باتیں یاد دلاتا۔ کون سے ایسے واقعات تھے مشترکہ طور پر جو ہم بتاتے اور ہم مل کر آپس میں باتیں کرتے۔

احمد شمیم کا نام اس کا ذکر اور اس کا فن ہمارے درمیان اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کے درمیان ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس نے انسانیت پر لکھا ہے، محبت کے لیے لکھا ہے، آزادی کے لیے لکھا اور یہ وہ جذبے ہیں جو زمین پر کبھی نہیں مریں گے اور احمد شمیم کی طرح ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

(روز نامہ جنگ)

ظفر اقبال نگینہ

چند لمحے برابر ٹیلی فون کی گھنٹی کی صدا گونجتی رہی میں کسی دوسرے کمرے میں کام میں مصروف تھا جونہی کریڈل تک پہنچا فون خاموش ہو گیا۔ بعد میں کسی دوست نے بتایا کہ احمد شمیم صاحب کی طرف سے کال تھی۔ یہ کال اس امید حسرت کا ماتمی لباس پہن کر میرے پہلوئے دل میں گوشہ نشین ہو گئی۔ دو دن کے بعد پتہ چلا احمد شمیم دل کا دورہ پڑنے سے اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے ہیں اور اب ان سے کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ یہ لمحے کس طرح گزرے ان لمحوں کا پہاڑ میں نے کیسے اُٹھائے رکھا، دل کی کیا حالت ہوئی اور گریباں پر کیا گزری۔ شاید میں کبھی قبائے الفاظ نہ پہنا سکوں۔ وہ صرف میرے دل میں ہی نہیں کئی محفلوں میں بدستور زندہ رہیں گے۔ ان کی باتیں، ان کی یادیں آتی رہیں گی۔ وہ بڑے عالم جلیے

نکال کر اہلِ محفل کو تڑپائے رکھتے تھے۔ ایک ایک جملے اور ایک ایک نقطے کی کئی کئی صورتیں ہوتی تھیں۔
اتنا سوہنا ادیب بے رحم موت نے ہم سے چھین لیا۔ مجبوری انسان کا مقام ـــ اے اللہ تو عظیم ہے!
وہ ایسے شاعر تھے جو شعر کے جال میں لا کر محبت کا ایسا مشروب پلا دیتے کہ وہ زندگی بھر اطاعت کا عہد کر بیٹھتا۔ سخن ور اور سخن فہم دونوں ہی ان کے شیدائی تھے۔ طبع زاد، شعر خانہ، ساز قہوہ اور زمانہ ساز لطائف ظرائف جن میں سیاست اور ظرافت کے اجزاء برابر کے پان کا مزا دیتے تو اہلِ محفل بھڑک جاتے تو احمد شمیم انہیں پکڑ کر کسی اور موضوع کی وادی میں لے آتے۔
جانے کتنے نوجوانوں کی سوچ کے دھاروں کو نئی راہوں پر ڈالا ہوگا۔ وہ یہی کارنامے انجام دینے کے لیے زندہ تھے اور اب یہ زندہ کتابیں احمد شمیم کو زندہ کریں گی۔
ایک بار ہم ایک ہی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ شمیم کو میں نے اس وقت دیکھا نہیں تھا۔ رشتہ خط و کتابت قائم ہو چکا تھا۔ ہمارے درمیان دو اور بندے حائل تھے۔ انہوں نے جھکتے ہوئے پوچھا:
ارے یار تم کون ہو؟
میں اللہ کا بندہ ہوں! اور آپ؟
میں وہ ہوں جو اللہ کے بندوں سے پیار کرنے والوں کو پوجتا ہوں۔
یہ بے تکلف دوستی کا بے ساختہ انداز، اجنبیت کے تکلفات کو پیام فنا دے گیا۔
اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوئی مجھے یہی احساس ہوا کہ کسی بہت ہی پیارے شخص سے ملاقات ہوئی ہے۔

(نوائے وقت ۲۱ ستمبر ۱۹۸۲ء)

منظور اقبال

منظور اقبال نے اپنے دلی جذبات کو الفاظ کا پیراہن دیتے ہوئے لکھا:
''احمد شمیم اپنی خوبیوں، اخلاق اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ کے لحاظ سے چھوٹے بڑے لوگوں میں یکساں مقبول تھے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ احمد شمیم دورے پر گیا ہے اور اپنا دورہ مکمل کر کے واپس آ جائے گا۔ تتلیوں سے سرگوشی کے بہانے احمد شمیم سفید چادر اوڑھ کر اپنی امی کے ہاتھوں کا پکایا ہوا ساگ اور بوسے لینے کے لیے دوسری طرف نکل گیا ہے۔''

(روز نامہ جنگ)

آغا ناصر

''احمد شمیم سے ہماری پندرہ سولہ سال سے شناسائی تھی۔ وہ بے پناہ ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا وہ جس قدر ذہین تھا دیکھنے میں اتنا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا باطن اس کے ظاہر سے بہت زیادہ Rich تھا۔ ریڈیو وغیرہ میں کام کرنے کی وجہ سے زود نویسی بھی اس کی خصوصیت تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے معیار سے کم کبھی نہیں لکھا۔ اس کی بعض تخلیقات تو بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ مثلاً اس کی نظم ''کبھی ہم خوبصورت تھے''۔ احمد شمیم بہت پیارا دوست اور شخص تھا۔''

(روز نامہ جنگ)

فتح محمد ملک

فتح محمد ملک نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''احمد شمیم عمر بھر نا سازگار حالات کو سازگار بنانے کی جدو جہد میں معروف رہا۔ اس کی شاعری اور اس کی تنقید اسی جدو جہد کا ثمر ہے۔ وہ ایک ایسے فنکار کی مثال ہے جس کا فنی جوہر حالات کی ستم گاری کے باعث پوری طرح بروئے کار نہ آ سکا۔ اس کے باوجود اس کی نظمیں ترقی پسند شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ کاش اس کی نظمیں اور اس کی تنقید کتابی صورت میں شائع ہوں۔''

(ہمیں ماتھے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

احمد داؤد

احمد داؤد لکھتے ہیں:

''احمد شمیم کے ہاں شاعری خصوصاً نظم محض تجربہ نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا وسیلہ ہے اس وسیلے کی رو سے اس نے اپنے عہد کے جمالیاتی اور تمدنی آشوب کو روایت کے آئینہ میں رکھ کر نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔''

(ہمیں ماتھے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

جمیل ملک

"میں برسوں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ میں دو دن کے لیے لاہور گیا تو وہ اپنے آپ کو تنہا پا کر اچانک غائب ہوگیا۔ وہ اپنے مسیحا۔ اپنے محافظ کو شہ مات دے گیا۔ اب میں اُسے کہاں کہاں تلاش کروں۔"

(فنون)

ممتاز مفتی

"احمد شمیم ایک چوکھیا دیا بجھ گیا"

(روز نامہ جنگ)

شفقت تنویر مرزا

"احمد شمیم پرندوں کے پروں پر خوبصورت لفظ لکھنے کی ضرورت سے آزاد ہوگیا۔"

(روز نامہ تعمیر)

رضا ہمدانی

"احمد شمیم کی اچانک موت پاکستان اور کشمیر کے لیے ایک دبستان کی موت سے کسی طرح کم نہیں۔ انہوں نے اپنی مختصری زندگی (۵۱) سال میں کیا کیا دکھ نہ اُٹھائے۔ اس کے باوجود لوح وقلم کی پرورش سے انہوں نے منہ نہیں موڑا۔ احمد شمیم ایک ایسا ہمہ جہت اہلِ قلم تھا جس کا نعم البدل مشکل ہی سے دستیاب ہوگا۔ ان کی تحریروں میں مطالعہ کی وسعت بھی تھی اور نظریاتی اعتبار سے ایک ہمواری بھی۔

(روز نامہ جنگ)

مظہر الاسلام

مظہر الاسلام نے لکھا:

"احمد شمیم: تمہارے جانے کے بعد موت کا فلسفہ سمجھ میں آ گیا۔

اب جب کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ احمد شمیم کہاں ہے تو میں اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا ہوں۔
''اس رات بہت بارش تھی''۔

(ھمیں ماتھے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

منو بھائی

احمد شمیم جو کل صبح راولپنڈی میں دم توڑ گیا اور جسے گزشتہ سہ پہر قبرستان عیدگاہ میں دفن کر دیا گیا، میرے آغاز سفر کا ساتھی تھا۔
ٹیلی ویژن دیکھنے والوں نے بھی نیرہ نور کی آواز میں احمد شمیم کی یہ نظم سنی ہوگی۔

کبھی ہم خوبصورت تھے
کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی

احمد شمیم کے اس ''ہم'' میں وہ سب خوبصورت لوگ شامل ہیں جو آغاز سفر کے ساتھی تھے جن کی سانس کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت ساکن تھی

آغاز سفر کے ان خوبصورت ساتھیوں میں جمیل ملک، احمد ظفر، افضل پرویز، توصیف تبسم، منصور قیصر، مختار صدیقی، باقی صدیقی، احمد شمیم اور بہت سے دوست شامل ہیں۔ کوئی ساتھی چلتے چلتے تھک جاتا تھا تو اُسے ہمت دیتے تھے، کوئی ٹھوکر کھا کر گرتا تھا تو اُسے اٹھا کر ہم سفر بناتے تھے۔ مایوسیوں کے آنگن میں امید کی کرن بن کر اترتے تھے، ڈھارس بندھاتے تھے، شعروں کے چراغ جلاتے تھے۔

آغاز سفر کے ان خوبصورت ساتھیوں کی یادیں آج بھی زادِ سفر ہیں۔ چلتے چلتے تھک جائیں تو کوئی نہ کوئی یاد ہاتھ پکڑ لیتی ہے، ٹھوکر لگے تو ان کے پرانے مشوروں میں سے کوئی مشورہ سہارا دیتا ہے۔ احمد شمیم نے کہا تھا۔''کوئی دوست کبھی دھوکا نہیں دیتا، دھوکہ دیتی ہیں تو وہ توقعات جو آپ اپنے دوستوں سے وابستہ کرتے ہیں، چنانچہ دوستوں پر الزام نہیں دینا چاہئے کہ قصور ہماری توقعات کا ہوتا ہے''۔ احمد شمیم کے منہ سے کبھی کسی دوست کا شکوہ سننے میں نہیں آیا۔ ہمیشہ اور ہر حالت میں اس کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ دیکھنے کو ملی۔ یہ خوبصورت مسکراہٹ اس نے موت کی گود میں لیٹتے اور اٹھتے وقت بھی قائم رکھی۔ مجھے یقین ہے کہ قبر کے اندر بھی وہ یہ مسکراہٹ اپنے ان دوستوں کے لیے چھوڑ گیا جنہیں

رنگوں کے جگنو اور روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں اور نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ کھڑکی سے بلاتی ہے اور یہ مسکراہٹ ماؤں کے بوسوں کو ترسنے والی پیشانیوں پر بوسہ دیتی ہے۔

(جنگل اداس ہے سے اقتباس)

منصور قیصر

ریڈیو سٹیشن سے یعقوب لالی کا فون آیا اور پوچھنے لگا اپنی تقریر کب ریکارڈ کراؤ گے؟ میں نے کہا میں نے تو ابھی لکھی بھی نہیں۔ فکر نہ کرو میں وقت پر آ کر Live نشر کروں گا۔ Live کا سن کر یعقوب لالی قریب قریب خوفزدہ لہجے میں بولے:

''نہیں نہیں، بس آ کر ریکارڈ کروا جانا۔ احمد شمیم نے بھی تو Live کے لیے کہا تھا مگر......

''مگر احمد شمیم کو کیا ہوا؟''

تمہیں نہیں معلوم صبح اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ عصر کے بعد اس کا جنازہ ہے۔ میں مزید کوئی بات نہ کر سکا اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ احمد شمیم حسب عادت ایک بار پھر سرپرائز دے گیا۔ اس کی موت کا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے کوئٹہ جانے سے صرف ایک روز پہلے اس نے مجھ سے live باتیں کی تھیں۔ وہ ہمیشہ زندہ اور متحرک باتوں کا دلدادہ تھا جب کہ ریڈیو کو ریکارڈ اور بے جان تقریروں کی ضرورت تھی۔

اردو، انگریزی اور کشمیری زبانوں پر پوری طرح کمال رکھنے والا احمد شمیم بنیادی طور پر ترقی پسند ادیب تھا۔ عصر کے وقت جب نشایاد اور غضنفر مہدی احمد شمیم کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کے لیے جا رہے تھے تو گزشتہ بیس پچیس برس پر پھیلی ہوئی یادیں میری آنکھوں کے سامنے مونتاژ بنا رہی تھیں۔ کیسی محفلیں جما کرتیں ان محفلوں کی جان احمد شمیم، مختار صدیقی ہوتے اور محفلوں کو گرم رکھنے والوں میں استاد یوسف ظفر، باقی صدیقی، عطا حسین کلیم شامل ہوا کرتے تھے۔ ہماری قربتوں کا دور شروع ہوا تھا۔ یہیں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا آئیڈیل کشمیر ہے جس کی آزادی کے لیے اس نے بڑے عذاب سہے تھے۔ وہ قید بھی رہا اور جب صعوبتیں بڑھیں تو اُسے وطنِ عزیز کے ساتھ ماں جیسی عظیم ہستی کو بھی چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنی پڑی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کشمیر کی آزادی تھی اور وہ ایک آزاد کشمیر میں واپس جانا چاہتا تھا لیکن وقت نے انہیں زندگی سے آزاد کر دیا۔

(ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو سے اقتباس)

سعود ساحر

احمد شمیم خوشبو کا خریدار تھا بیوپاریوں کے ہاتھوں لٹ گیا، لیکن آج جب میں احمد شمیم کی موت پر ایک لمحے کے لیے رک کر سوچتا ہوں تو اپنی اوقات بھی کولہو کے بیل سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ ہمارے عہد کے فکری منظر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم بنیادی طور پر بت پرست ہیں۔ نظری بتوں کی پوجا ہمارا مسلک ہے۔ ہم عمل کی دنیا میں صنم خانے تعمیر کرتے ہیں۔ ان پر اپنی خواہشات کے مطابق پسند کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں۔ دایاں، بایاں، سرخ، سبز، رجعت پسند، ترقی پسند، انقلابی، انقلاب دشمن یہ الفاظ ہم نے لغت سے یوں نکال لیے ہیں کہ ان کے معنی و مطالب لغت کے صفحات پر کہیں رہ گئے ہیں۔ میری اور احمد شمیم کی خاموش مفاہمت ان الفاظ کے حقیقی مطالب پر تھی۔ احمد شمیم ہمارے فکری منظر پر ابھرنے والی ایک اجلی روح کا نام تھا۔ احمد شمیم تو ایک فنکار تھا۔

احمد شمیم ان لوگوں میں سے تھا جو ایک خاص ذہن رکھتے ہیں جن کی سوچ کے اپنے زاویے ہیں، جو جینے کا ایک قرینہ رکھتے ہیں اور زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔

(ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو سے اقتباس)

سجاد حیدر ملک

احمد شمیم ہمیں خوفزدہ کر گیا۔ جس دن جس لمحے اس کی وفات کی خبر پھیلی اچانک اور غیر متوقع محسوس ہوا کہ اس کے ہمعصروں میں فنا کا نقارہ پٹ گیا ہے۔ اب چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے کچھ کرنا ہے تو جلدی جلدی کر لو۔ ادیبوں نے کیا کرنا ہوتا ہے کچھ اور حروف جوڑنے ہوتے ہیں کچھ لکھنا ہوتا ہے خواہش ہوئی کہ کچھ لکھا جائے وہ زمین اور جائیداد تو کیا چھوڑیں گے ہاں کتاب چھوڑ جانے کا لالچ بہت ہوتا ہے۔ احمد شمیم اپنی بیوی اور بچوں کو سوگوار چھوڑ گیا لیکن اس ادیب دوستوں نے شدت سے محسوس کیا کہ اتنا کچھ لکھنے والا اور کہنے والا احمد شمیم کتاب کیوں نہیں چھوڑ گیا۔

لیکن جب تک وہ زندہ تھا کسی کو بھی اس بات کا گلہ شکوہ نہ ہوا، اس نے اتنا پڑھ رکھا تھا کہ کئی کتابیں، بے شمار کتابیں اس کے اندر جذب تھیں۔ یونانی، دیومالائی داستانیں، یورپی ادب، لوک ادب، پاکستانی، کشمیری اور مشرق وسطی کے مقامات مقدس، جدوجہد یہ سب کچھ اس کے شعور میں رچا ہوا تھا۔ یہ سب

کچھ اس کی نظموں میں یوں مربوط اور شامل تھا کہ تاریخی استعارے، روایتی حوالے اور ادبی علامتیں اور تلمیحات کے بغیر اس کے کلام کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی مطالعے کی وسعت نے اس کے مزاج میں ایک درشتی پیدا کر دی تھی۔ اس کے اپنے ہم عصر لیکن نوجوان نسل کے ساتھ ابلاغ کی کوشش اکثر ایک یک طرفہ کوشش کی مانند ہوتی اور اکثر اسی کوشش میں اس کی گفتگو Sense سے Non Sance کی طرف بامعنویت سے لامعنویت کی طرف حرکت کرتی نظر آتی ہے۔

(همیں ماتهے پہ بوسہ دوسے اقتباس)

کلیم اختر

وفات سے چند روز قبل شمیم نے مجھے چودھری خالد محمود کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ اب جب تم مظفر آباد آؤ گے تو تمہیں وہاں میری صورت نظر نہ آئے گی۔ میں اس شہر ندامت سے بھاگ آیا ہوں۔ یہ پیغام سن کر مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ میں اس کے کرب اور درد کو سمجھتا تھا۔ میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مل سکا۔ چند دنوں بعد ٹیلی ویژن پر نیرہ نور اس کا خوبصورت گیت "کبھی ہم خوبصورت تھے" گا رہی تھی اور ساتھ ہی ایک دل دوز خبر سنی کہ احمد شمیم دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔

میں اور نسیم بھائی دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری۔ نسیم اور شمیم دونوں ہم جماعت تھے، دونوں دوست تھے۔ سری پرتاب کالج کے چناروں تلے یہ سب دوست پہروں اکٹھے بیٹھتے تھے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کرتے تھے۔ ان میں سعید، عزیز، طالب اور یوسف شامل تھے۔ آج ان کا سب سے پیارا دوست حسب معمول سب کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا۔ ۱۹۸۱ء کے شروع میں اس نے مجھے مظفر آباد سے جسے وہ شہر ندامت کہا کرتا تھا ایک مختصر سا خط لکھا اور کہا مجھے ایک طویل خط لکھو، بہت طویل، میں اس کے درد، دکھ اور کرب کو محسوس کرتا تھا۔ اس کے دکھ اور تنہائی کے زہر کو جانتا تھا اور اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ میرے ہم وطن کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ ناظم اطلاعات سے ہٹا کر ڈپٹی ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ اس نے حق تلفی کے خلاف ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ ہائی کورٹ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس روز شمیم نے قتیل شفائی کا یہ شعر لکھ کر مجھے بھیجا:

دیکھ میری اصول شرافت کہ لٹ کر بھی شرمندہ ہوں میں
جیت بھی لی اخلاص کی بازی ہار بھی اپنی مان رہا ہوں!

اس نے راولپنڈی میں اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور ریڈیو آزاد کشمیر سے وابستہ بھی رہا۔ اس کے ساتھ

ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی۔ مگر حالات نے اُسے آگے نہ بڑھنے دیا۔ وہ اپنی آگ میں سلگتا چلا گیا۔ چناروں کی آگ اندر ہی اندر ختم کرتی رہی۔ تا نکہ اس کا محبت کرنے والا دل اس کا ساتھ چھوڑنے لگا اور اس نے میر کو پکار کر کہا:

میر ملیں تو ان سے کہیو اب بھی اس دکھ نگری میں
تیرے بہانے اپنے فسانے کہتے ہیں دکھیارے لوگ

وہ شخص جسے ڈوگرہ پولیس اور بھارتی فوج شکست نہ دے سکی تھی اب وہ شکستہ پا ہو گیا تھا۔

(روزنامہ نوائے وقت)

جی ۔ایم مفتی

احمد شمیم شاعر تھے، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، فکرو شعور رکھنے والے ایک دردمند قومی کارکن بھی تھے۔ فکر وشعور رکھنے والے لڑکپن میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پاکستان میں چاروں طرف مفاد پرست ابن الوقت کشمیری معاشرے سے دوچار ہوئے۔ وظیفہ خوار طبقے نے اس کی صلاحیتوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس کی فکری اور نظریاتی بلندی کو پستی قرار دیا اور اس کے ترقی پرست رجحانات کو کیمونزم کی طرف لے جا کر اس کے خلاف ایک بلاجواز مہم شروع کر دی۔

احمد شمیم کو پہلی بار میں نے شبستان سینما مری روڈ راولپنڈی کے بکس میں دیکھا۔ یہ ۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے "اگر میں کہوں کہ آپ جی۔ ایم مفتی ہیں تو غلط نہ ہوگا" جی ہاں۔ مگر آپ؟ میں "احمد شمیم ہوں بھائی" دونوں بھائی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ "اچھا یہ بتاؤ مجھ سے ناراض کیوں ہو؟" "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ شمیم بولے یہ تو منافقت ہے۔

شمیم لوگوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ میر واعظ محمد عمر سے ذاتی قرب کے علاوہ کشمیر کا ہر سیاستدان اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا

احمد شمیم ایک سچے عاشق رسولؐ تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ سوشلسٹ نظریات رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دلی اور جذباتی طور پر کٹر مسلمان تھے۔

(احمد شمیم ۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں ،روزنامہ جنگ)

سجاد شیخ

وہ سرزمین کشمیر کا مایہ ناز ادیب انقلابی شاعر اور دانشور تھا۔ اپنے بے پناہ مطالعہ، مشاہدہ تاریخی بصیرت اور حالات حاضرہ پر گہری نظر کے باعث وہ ٹیبل ٹاک (Table talk) کا ماہر تھا اور اسی لیے دوستوں کی محفلوں میں ہمیشہ جان محفل رہا۔

احمد شمیم کی نظمیں ایک ایسے انسان کا پتہ دیتی ہیں جو عقابی نظر، واضح تخیل، گہری بصیرت، دیرپا حافظے، تیز حسیت اور حیرت انگیز تجزیاتی ذہن سے نوازا گیا ہے......

یہاں ہمارا تعارف ایک ایسے شاعر سے ہوتا ہے جس کی فنی مہارت اور چابکدستی لائق تحسین اور قوت بیان اور زبان پر دسترس قابلِ رشک ہے......وہ بے مثال حوصلے اور جرات کا مالک ہے اور بنی نوع انسان کو درپیش کثیر الجہتی مسائل پر اپنے پُر خلوص ردِ عمل کا برملا اظہار کرنے میں ہرگز تامل نہیں برتتا۔

احمد شمیم کی نظموں کا خمیر ان نتائج سے اٹھایا گیا ہے جو اس نے انسانی آلام اور تیسری دنیا بالخصوص بھارت، پاکستان اور کشمیر کی صورت حال پر شدید غور و خوض کے بعد اخذ کئے اور انہیں نہایت فنکارانہ انداز میں ان نظموں کے تار و پود میں بن دیا ہے۔

احمد شمیم کی نظمیں ہمیں ایک ایسے انسان سے متعارف کراتی ہیں جو متحارب نظریات اور کایا پلٹ دینے والے تجربات کے درمیان کھڑا ہے لیکن پُر امید ہے۔

(حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گئے مضمون سے اقتباس)

راجہ عبدالخالق خان

احمد شمیم مرحوم ہماری سروسز کا ایک قابل ترین اور ذمہ دار افسر تھا۔ معاشرتی ناہمواری، رنگ و نسل کے امتیاز، انسان سے انسان کے استحصال کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہا۔ دُنیائے ادب میں اس کا ایک امتیازی مقام ہے اور حقیقت میں وہ کشمیر کی پہچان ہے۔ اپنی تحریر و تقریر سے جبر و استبداد کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہا اور مظلومیت کا ترجمان۔

(سیکرٹری سروسز اینڈ جنرل ایڈ مینسٹریشن، اطلاعات، آزاد کشمیر، مظفر آباد، ریت پر سفر کا لمحہ)

عبدالمجید

کے معلوم تھا کہ غنی کاشمیری اور عبدالاحد آزاد کے بعد خطۂ کشمیر میں احمد شمیم کے روپ میں وطن کی آزادی کا متوالا اور اہل وطن میں محبت و پیار کا پیکر جنم لے گا۔ وہ بچپن ہی سے معاشرہ میں معاشی اور معاشرتی ناہمواری۔ رنگ و نسل کے امتیاز اور انسان کے انسان پر غلبہ اور تسلط کے خلاف تھا۔ مفلس اور نادار زندگی کی آسائشوں سے محروم طبقہ نے اسکے دل و دماغ کو بے حد متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ گھنٹوں کتابوں کے اوراق میں گم انسانیت کی عظمت کی تلاش میں رہتا، وہ گوشہ تنہائی میں افکار کے تلاطم کی گہرائیوں میں بھی ڈوب جاتا۔ ہاں ادب وعلم اور سیاسی افکار کی محفلوں میں وہ چہک اُٹھتا۔ اپنی سوچ اور دل کی بات برملا کہتا۔ وہ محفل کی جان تھا، ہر کوئی اسے صرف اور صرف اپنا ہی سمجھتا۔

وہ سرزمین کشمیر کا مایہ ناز ادیب، انقلابی شاعر اور دانشور تھا۔ وطن اور اہل وطن کے ساتھ محبت و پیار کی آزادی اور عظمت کے حصول کا جذبہ اس میں بدرجہ اتم رہا ہے۔ اس کا کلام انہی افکار سے عبارت ہے۔ معاشرہ میں سکوت و جمود اور رجعت پسندی اسے سخت ناگوار تھی وہ زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب کا متمنی تھا، یہی وجہ ہے کہ انقلابی قوتوں سے اسے لگاؤ ہے۔

(ریت پر سفر کا لمحہ سے اقتباس)

The Muslim

8- The Muslim /اگست کی اشاعت میں احمد شمیم کی وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع کی:

"Kashmiri Poet Ahmed Shamim is dead, President of Azad Jammu and Kashmir Brig Mohammad Hayat Khan, Chaudhary Nizamuddin have expressed deep condolenees on the sudden death of Mr. Ahmad Shamim and sympathized with the bereaved family."

کہانی سچ کہتی ہے۔ کہانی کے سب سے پہلے ورق پر احمد شمیم ایک نہایت شفیق باپ کی طرح مثبت سوچ کے رنگوں سے ہمارے اندر نئے جزیرے تلاش کر کے زندگی کے سارے تخلیقی رنگوں سے ہمیں متعارف کرواتا، الف لیلہ کی کہانیوں سے لے کر ہملیٹ تک سب کرداروں کو سوچ کے جسم پر ناچتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

سترہ سال تک وہ میری اُنگلی پکڑ کر چلتے رہے۔ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے، ٹیلی ویژن یا اسٹیج کے لیے، میرے لیے ایک کردار ضرور تخلیق کرتے جب میں نے میٹرک میں پہلی نظم لکھی تو انہوں نے میری ماں سے کہا بھئی ہمارا بیٹا شاعر ہو گیا ہے۔ گارڈن کالج میں جب میں سٹوڈنٹ یونین کا الیکشن جیت کر جنرل سیکریٹری منتخب ہوا تو بظاہر وہ نالاں نظر آئے لیکن اندر سے میری اس جیت پر رقص کرتا ہوا غلام احمد روشن ہوا۔

1982ء کی ایک گیلی رات جب انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تو انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا اب تمہارا کیا بنے گا۔ میں نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کی آنکھ سے ایک آنسو نکلتا ہوا دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی آنکھ سے نکلنے والا آخری آنسو ہے۔ لیکن ایک عجیب کیفیت مجھ پر اس وقت طاری ہوئی جب آخری دفعہ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے انہوں نے اپنی ساری تخلیقات، سوچیں، ناکامیاں، کامیابیاں اور دنیا کی سب سے طویل نظم لکھنے کی خواہش میرے اندر منتقل کر دی ہے اور سوچ کے اس خیمے میں ہم دونوں پچھلے کئی برسوں سے گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ اب میرے اندر زندہ ہیں۔

کہانی ہمیشہ سچ بولتی ہے! کہانی احمد شمیم کی اُس اُداسی کو کیسے بھول سکتی ہے جب اس کا سارا جسم اداسی کی بارش میں بھیگا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کہانی کہتی ہے کہ عید کا دن احمد شمیم تنہا سوچوں کی قیامتیں پیمن کر وادیٔ کشمیر میں اپنے بچھڑے ہوئے والدین، بہن، بھائی کے ساتھ کوچ کر جاتے تھے۔ جنہیں وہ سترہ سال کی عمر میں چھوڑ کر۔ وطن کی آزادی کے خواب لیکر پاکستان آ گئے تھے۔ کہانی کہتی ہے عید کا دن ابو کے لیے سب سے اداس دن ہوتا تھا۔

جب بھی ان کا دوست طاؤس بانہالی ہمارے گھر آتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ ہم سب ماں کے ساتھ سیر کو چلے جائیں اور اکثر ہمارے جانے کے بعد دونوں کشمیری آزادی کے متوالے دوست گھر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیتے تا کہ کوئی تیسرا شخص ان کی محفل میں مداخلت نہ

کرے۔ شاید دونوں دوست دیر تک جھیل ڈل کی باتیں، آزادی کشمیر کی باتیں، کشمیری زبان میں دیر تک کرتے، یا پھر کہانی مکمل طور پر بتاتی نہیں کہ دونوں دیر تک گھر سے دوری کے دوزخ پر ایک دوسرے کے آنسوؤں سے اپنا کیتھارسس نکالتے۔

کہانی یہ بھی کہتی ہے کہ احمد شمیم کو ہملیٹ بہت پسند تھا۔ کہانی یہ بھی کہتی ہے کہ احمد شمیم کی قبر کے ساتھ ایک چھوٹی سے قبر میں ہملیٹ کی کہانی کو بھی دفن کیا گیا۔ کہانی کبھی جھوٹ نہیں بولتی، کہانی ہمیشہ سچ کہتی ہے۔

منظوم خراج عقیدت

احمد شمیم کے انتقال پر بہت سے شعرائے کرام نے ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے منظوم نذرانے لکھے جو فنون، روزنامہ تعمیر، روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت اور آزاد کشمیر کے بہت سے روزناموں اور ماہناموں میں شائع ہوئے:

اداسیوں میں آج کیوں یہ سماں بدل گیا
اِک آہ میں سب کا دامن اشکوں سے بھر گیا
وائے اجل ! تو نے یہ کیا کیا ؟
وہ پیکرِ خلوص ، وہ محسن کہاں گیا !
وہ جانِ محفل جسے شمیم کہتے تھے
آج پل بھر میں ہم سے بچھڑ گیا

(روزنامہ تعمیر۔اگست ۱۹۸۲ء)

تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس کے اجڑے فقیر
دکھ کے ان جلتے تھلوں میں
جب کبھی تم دیکھتے تھے
کوئی آوارہ سا بادل
آسماں پر
تب تمہارے ذہن کے جلتے تھے منظر
ڈل کنارے
زعفراں کے کھیت میں
گرتی پھواریں، آبشاریں
تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس کے اجڑے فقیر

ہو سکے تو
روشنی کی نظم کو لکھ کے ہم کو بھیج دینا
راستوں پر راج ہے تاریکیوں کا
اور ہم لوگوں کو بھی
تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے کبھی

(محسن شکیل راجہ ۔ روزنامہ جنگ ۔ ۱۷/۱ اگست)

''احمد شمیم کی یاد میں''

سبز سایہ

اداس شاخوں پر برف افسوس کی کہانی سنا رہی ہے ___
طویل لفظوں کی معنویت سفید چادر میں چھپ گئی ہے ___
پہاڑ لمحوں پہ تیرے دکھ کے تمام موسم زوال ساعت سے لرز رہے ہیں!
قرار رنگوں کو تتلیوں کے پروں پر تیری محبتوں کی کہانیاں ہیں
افق کے ہونٹوں پہ تیری انگلی کا سبز سایہ ٹھہر گیا ہے
جو تو نے سوچا
وہ اب صدا کے سمندروں میں امر جہازوں کا راستہ ہے
جو تو نے لکھا
وہ تیز بارش میں قطرہ قطرہ اترتی حیرت کا معجزہ ہے
وہ آگہی کی طلب میں ہجرت کا حوصلہ بھی بنا رہے گا

(سحر صدیقی ۔ فنون ، لاهور)

اک نظم

تتلیوں، جگنوؤں اور پھولوں کی آغوش میں
روشنی رنگ و مہکار کا سحر
تاریکیوں، نفرتوں اور سازشوں کے حصار میں
پھیلا رہا تھا
بدن جس کا
اپنے معاصر کے اشغال کی گرد سے
چند لمحوں کو میلا رہا تھا

وہی عطر بیز اور اجلا بدن
کیوں ہر اک مہربان کی نظر کا ہدف ہے
ہمیں باعث فخر و عز و شرف ہے

(صفدر صدیقی رضی ۔ فنون)

"ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو"
وہ اک بے درد لمحہ تھا
جو تم سے سانس لینے کی ہر اک مہلت
نہ جانے کس سمندر میں ڈبو آیا
ابھی تم کو بہت جینا تھا
اجلے منظروں کو دیکھنے کی چاہ میں
اس نے زندگی کی راہ میں
اس راہ پر جب بھی تمہیں
کشمیر میں بیتے زمانے یاد آتے تھے تو
تم روتے تھے
آنکھوں میں سسکتی سسکیاں
ہونٹوں میں دب کر ٹوٹ جاتی تھیں
تو تم بے ساختہ کہتے
کہ "امی تتلیوں کے پر بہت ہی خوبصورت ہیں"
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

☆

مگر ماتھے پہ بوسہ ثبت کرنے والی مائیں تو
بہت پہلے ہی مر جاتی ہیں
بوسے کی تمنا خواب ہو جاتی ہے
تمہیں ان جگنوؤں نے
روشنی کی تتلیوں نے کیا صدا دی تھی
کہ اس سرعت سے تم اپنے
رفیقوں، بیٹیوں، بیٹے کو روتا اور سسکتا چھوڑ کر

ان منزلوں کو چل دیئے
جن سے کوئی واپس نہیں آیا
منیرہ اب کسے آواز دے گی
کس سے پوچھے گی
مرا شاعر کہاں ہے!
ستواحمد شمیم
اک عمر تم کو اپنے ماتھے پر کسی بوسے کی خواہش تھی
اس اک بوسے کی خواہش نے
تمہیں ویران کر ڈالا
مگر وہ پیار، بوسہ، جو ابھی تم نے
ودائی گیت کے جھرمٹ میں
اپنی بیٹیوں کی چاندی پیشانیوں پر
ثبت کرنا تھا
کہاں ہے؟
بیٹیاں اس پیارے بوسے کو
کہاں ڈھونڈیں؟
تمہیں کہہ دو
کہو نا _ اب انہیں ماتھے پہ بوسہ کون دے گا
کون دے گا؟

(حسن عباس رضا ۔ فنون)

"ڈیڈ لائین"
عدیلہ فون پر کہتی ہے
ابو گھر کب آئیں گے
جواب آتا ہے
بیٹی جلد آؤں گا
تیری خاطر بڑے جیسے
نرالے، خوبصورت، بھولے بھالے

نرم و نازک سے کھلونے ساتھ لاؤں گا
اور ان میں سب سے پیارا
ایک ٹیلی فون بھی ہوگا
وہ جس کی سانس کی ڈوری
تجھے مجھ سے ملاتی ہے
مجھے جینا سکھاتی ہے
عدیلہ اپنے ننھے سے کھلونے
اپنے ٹیلی فون سے باتیں کرے
کھیلے کہ روئے
اپنے ابو کو پکارے
کچھ نہیں حاصل
افق کے اس کنارے سے ریسور کون اُٹھائے گا
یہاں اب کون آئے گا
کہ ٹیلی فون کا وہ رابطہ
وہ سانس کی ڈوری
تو کب کی کٹ چکی ہے
اب تو اس آواز کی
اس دور سے آئی ہوئی آواز کی
اک گونج باقی ہے
فقط اک گونج باقی ہے!

(جمیل ملک: فنون)

"احمد شمیم کے لیے نوحہ"
آج میں نے اپنی زندگی کے ایک اور آنسو کو دفن کر دیا
اور اک آنسو جو تیرے نہ ہونے کی نشانی ہے
اس کی لاش کو لیے لیے پھرتا رہوں گا اس لمحے تک
جب میں خود بھی بے معنی ہو جاؤں گا

اور اک وہ خواب جو تم نے اُڑتی ہواؤں کے سنگ دیکھا تھا
وہ میری آنکھوں کے رت جگوں میں
جاگتا رہے گا اس لمحے تک
جب میں اپنی نیند سو جاؤں گا
موت ایک ایسی حقیقت ہے
جو ہماری سچائیوں کی بے یقینی
لیکن تم نے موت کے ان کہے لفظوں میں شعر کہے
تم نے موت کو جیون بخشا
اپنا جیون ہار دیا
میں تیرے جیون کی مٹی میں اپنی مٹی ڈھونڈتا ہوں اس لمحے تک
جب میں مٹی ہو جاؤں گا

(فہم جوزی :روزنامہ جنگ)

عارف کمپلوی:
''تمہیں خوشبو کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی تھیں
سو تم اس آہنی ماحول کے سنگلاخ منظر
نظر کے طاقچوں میں لے کے خاموشی کے ابدی سرمئی
غاروں میں جا اترے
تحسن کی چاندنی دیتے __ کچھ کہتے
ابھی رہتے، ابھی ہم کو طلب تھی
خوبصورت خوب تر نظموں کی گیتوں کی۔

(همیں ماتھے په بوسه دو)

احمد شمیم : ایک انٹرویو

ارشاد ارشی لکھتی ہیں:

اس انٹرویو میں جہاں احمد شمیم نے زندگی کے بے شمار حقائق پر سے پردہ اٹھایا وہاں انہیں اپنی اصل حقیقت یعنی اپنی خوبصورت سی چمکتی ہوئی چندیا، جسے ہماری معصوم آنکھوں نے بہت دفعہ دھوپ میں صبح تو کے سورج کی طرح چمکتے ہوئے دیکھا ہے۔ قارئین سے چھپانے کے لیے ماؤ کیپ پہن لی اور اب ہمارا فوٹو گرافر کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو یہ تو نہیں کر سکتا کہ پرنٹ بناتے وقت احمد شمیم کی ٹوپی اُڑا لیتا۔

بیوی خوبصورت سمارٹ اور پُرکشش ہو تو بندہ جہاں اور بہت سی احتیاطیں برتتا ہے وہاں یہ احتیاط خاص طور پر برتتا ہے کہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے، شاپنگ کرتے ہوئے، فلم دیکھتے ہوئے اور انٹرویو کے لیے تصویر کھنچواتے ہوئے کچھ نہ کچھ تو خوبصورت نظر آئے۔

احمد شمیم صاحب حکومت آزاد کشمیر کے انفارمیشن ڈائریکٹر ہیں۔ شعر کہتے ہیں، ڈرامے لکھتے ہیں، افسانے لکھتے ہیں، انسان کی عزت نفس اور آزادی کی باتیں کرتے ہیں۔ جس سلیقے سے انہوں نے محبت نبھائی اسی سلیقے سے نوکری نبھا رہے ہیں۔

بہت دنوں سے ہم احمد شمیم کا انٹرویو بمعہ اہل وعیال لینے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن ہماری ازلی سستی اڑے آئی۔ پچھلے دنوں جب بغیر کسی پروگرام کے احمد شمیم بیمار ہو کر ہسپتال جا پڑے اور اپنا چھوٹا سا ٹائپ رائٹر بھی ساتھ لے گئے۔ پتا چلا وہ دل کے مریض ہیں۔ ہم نے احتیاطاً اور اخلاقاً ان کا انٹرویو لینے کا فیصلہ کیا اور ان کے دفتر جا پہنچے۔ انہوں نے ڈھیر سی فائلوں کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ اور پوچھا چائے پیو گی!

جی میں ابھی ابھی پی کر آئی ہوں۔ ہم نے سعادت مندی سے کہا۔

بکواس کرتی ہو۔ انہوں نے فائل پر دستخط کرتے ہوئے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں بڑی بے نیازی سے کہا۔

جی حقیقت ہے کہ ابھی ابھی دو مرتبہ چائے پی ہے۔

''دو مرتبہ بکواس کرتی ہو'' انہوں نے اسی شانِ بے نیازی سے فرمایا۔ اور ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔

انٹرویو کرنے آ جاؤں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ احمد شمیم چپراسی کو ایک خبر لکھ کر دے رہے تھے جو 'جنگ' میں دینی تھی۔ ایک اور چٹ پر لکھا "شام کو پانچ بجے ارشی آ رہی ہے" اور چپراسی کو پکڑا دی۔ واپسی پر گھر دیتے آنا۔

چپراسی کی غیر حاضر دماغی ہم بہت دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں دھڑکا تھا کہ وہ خبر گھر دے آئے گا اور ہمارے آنے کی خبر والی چٹ جنگ کے آفس میں دے آئے گا۔ احمد شمیم سے اس دھوکے کا اظہار کیا تو وہ بولے "کوئی فرق نہیں پڑے گا"

شام کو ملاقات ہوئی تو احمد شمیم نے بتایا کہ ان کا نام۔ اصلی نام غلام محمد ہے جو پانچویں جماعت تک رہا۔ چھٹی جماعت میں پہنچنے تک وہ سوشلسٹ نظریات کے پیروکار ہو چکے تھے لہٰذا نام بدل کر احمد شمیم رکھ لیا جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سوشلزم اور شمیم دونوں میں ش مشترک ہے۔ اتنی طویل گفتگو کے بعد بھی کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا کہ انٹرویو کہاں سے شروع کیا جائے۔ احمد شمیم کو کس حیثیت سے پیش کیا جائے۔ انفارمیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے، ڈرامہ نویس کی حیثیت سے، شاعر کی حیثیت سے، سیف الملوک کی طرح سفر پر جانے والے بیٹے کی حیثیت سے، شوہر کی حیثیت سے۔ بہر حال بہت سی باتیں ہوئی۔ منیرہ بتا رہی تھی ان کے افسانوں کا مجموعہ اجنبی، اجنبی جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔ میں نے سمجھایا تھا، اس کا نام "بے گیان کا گوتم" رکھ لو۔ احمد شمیم نے لقمہ دیا۔ منیرہ تین چار سال سے افسانے لکھ رہی ہے۔ پاگل کے ساتھ رہتے رہتے انسان تھوڑا بہت پاگل ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن منیرہ کا خیال ہے کہ پاگلوں کے ساتھ رہنے کا تجربہ بڑا خوشگوار ہے۔ منیرہ نے کہا۔ میں نے پہلا افسانہ لکھا شمیم کو دکھایا۔ انہوں نے کہا اچھا ہے لکھا کرو اور ہمیں یقین ہے کہ اچھا ہو گا تبھی اچھا کہا۔ ورنہ وہ تو بے رحمی کی حد تک سچے اور تلخ گو ہیں۔ احمد ندیم قاسمی سے اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کہتے ہیں:

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم
زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے

لیکن یہاں زخموں کے ناسور بن جانے کی پیش گوئی کرنے میں احمد شمیم کا جواب نہیں۔
ہمیں کھانستے ہوئے دیکھ کر بولے۔ "کھانسو، کھانسو، اب تمہیں ٹی۔ بی ہو جائے گی۔"
ہمیں ایسی رومانٹک بیماری کہاں ہونے لگی۔ ہم نے جواب دیا۔
منسٹری آف کشمیر سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ ۱۶ سال کی عمر میں پہلی جیل کاٹی اور پہلا عشق کس عمر میں کیا؟
جس عمر میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر پر حملہ کیا۔ منیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:
"یہ میرا راجہ داہر ہے" عشق بہت ٹوٹ کر کیا۔
ایک دفعہ تنہائی کا اتنا شدید احساس ہوا کہ سوچا منیرہ سے شادی کر لینی چاہیے، تب منیرہ سے شادی

کر لی۔ بیوی کو لے آئے اور نکاح نامہ وہیں چھوڑ آئے کہ کاغذ کے ٹکڑوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہی حرکت ایک مرتبہ پہلے بھی کر چکے تھے کہ بی۔اے کی ڈگری ردی کاغذوں کے اوپر رکھ کر بیچ دی۔

لکھنے کا شوق شروع سے تھا۔ آٹھویں جماعت میں تھے تو علامہ اقبال پر نظم لکھی جو روزنامہ ہمدرد میں شائع ہوئی۔ اپنے جیب خرچ سے بارہ اخبار خریدے اور ہر کمرے میں ایک ایک اخبار رکھ دیا تا کہ گھر والے دیکھیں اور ان کی قابلیت کا رعب پڑے۔ اس کے بعد چھپ کر دیکھتے رہے کہ کوئی اخبار دیکھ رہا ہے یا نہیں! اور نہ دیکھنے والے کو دل میں ہزاروں ہی گالیاں دے ڈالیں۔

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے موقع پر ایک نظم لکھی:

مناجات کی رسم باقی ہے لیکن علم گر چکے ہیں
علم کون اُٹھائے کہ ہاتھوں نے سوچوں کی زنجیر پہنی ہوئی ہے

۱۹۷۱ء میں ادھر مشرقی پاکستان ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا ادھر اُن کا دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا یعنی پہلی مرتبہ ہارٹ اٹیک ہوا، بہت شدید ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا مر جاؤ گے۔ انہوں نے کہا مر نہیں سکتا۔ اپنے اندر کی ساری تخلیقی صلاحیتوں کو جمع کیا اور زندہ رہنے پر بضد رہے۔

بچپن میں پیسے کی تنگی رہی، اس لیے پیسے سے نفرت ہوگئی، ہاں البتہ بچوں کو بہت پیسے دیتے ہیں۔

بقول عکسی ابو پیسے دیتے ہیں تو میں کتابیں خریدتا ہوں، پڑھتا ہوں۔ سامی سارے پیسے امی کو دے دیتی ہے۔ فائزہ کہتی ہے ابو بڑی مشکل باتیں کرتے ہیں۔ ابو کی شاعری نہیں پڑھی نہیں معلوم کہ وہ کیسے شاعر ہیں۔

احمد شمیم کا آئیڈیل ان کی والدہ تھیں۔ دبلی پتلی اور خوبصورت، منیرہ میں انہیں یہ تمام خوبیاں نظر آئیں، لہٰذا محبت کر بیٹھے۔ منیرہ کے ذہن میں کوئی آئیڈیل نہیں تھا، یہ ملے تو یہی آئیڈیل بن گئے:

جو ملا پہلے وہی اپنی نظر میں جچ گیا!
میں نے کب چاہا تھا تجھ کو شہر بھر کو دیکھ کر!

احمد شمیم کا کہنا ہے کہ لڑکی بے چاری نرم و نازک بیل ہوتی ہے جو قریب ترین درخت سے لپٹ کر اس پر چڑھ جاتی ہے، ہمیں لڑکی بے چاری پر اعتراض ہوا تو اپنے بیان کو کچھ اس طرح کر دیا کہ لڑکی نرم و نازک بیل ہوتی ہے جو بیچارے قریب ترین درخت سے لپٹ جاتی ہے اور پھر آکاس بیل بن کر اسے چاٹ جاتی ہے۔

کہتے ہیں اس دور میں انسان کا سب سے بڑا خوف روٹی ہے، سوشلسٹ معاشرے میں یہ خوف نہیں ہوگا۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ہاں جب کسی عورت کا خاوند مرتا ہے تو وہ خاوند کو نہیں روتی، روٹی کو روتی ہے۔ کشمیری عورت بین کرتی ہے تو کہتی ہے "ہاہتو" یعنی ہائے میری روٹی۔

ہم نے منیرہ سے پوچھا کہ اگر کبھی ایسا نازک لمحہ آجائے کہ عورت کو خاوند اور بچوں میں سے کسی ایک کا

انتخاب کرنا پڑے تو وہ کس کا انتخاب کرے گی۔ منیرہ سوچ میں پڑ گئی۔

بول بیوی بول _ آج تو تجھے میرے سامنے سچ بولنا پڑ گیا، احمد شمیم نے لقمہ دیا اور پھر بیوی کو سچ کی صلیب پر چڑھنے سے بچانے کے لیے خود ہی بولے۔ عورت کا دل بچوں میں اٹکا ہوگا لیکن مصلحتاً وہ خاوند کو منتخب کرے گی کیونکہ خاوند اس کی روٹی ہے۔ روٹی پر زندگی کا دارومدار ہے اور زندہ رہنے کی خواہش سے بڑھ کر کوئی خواہش نہیں ہوتی۔

آپ نے اس عورت کا واقعہ نہیں سنا جو بچے سمیت سیلاب میں گھر گئی تھی۔ اس نے بچے کو بچانے کے لیے کندھے پر بٹھا لیا۔ پانی کندھوں تک پہنچا تو بچے کو سر پر بٹھا لیا۔ پانی سر سے اُوپر ہوا تو بچے کو پاؤں کے نیچے رکھ کر اس پر کھڑی ہوگئی۔ تو صاحب زندگی کتنی بھی ظالمانہ، بے معنی اور اپاہج ہو بہر حال بہت عزیز ہوتی ہے۔

اور عزیز تو احمد شمیم کو اپنے خواب بھی بہت ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے ۱۶ سال کی عمر میں گھر چھوڑا اور سری نگر سے پاکستان چلے آئے اور پھر لوٹ کر گھر نہیں گئے۔ واقعی ہاتھ کی لکیروں پر ایمان نہ رکھنے کے باوجود اس جوتشی کی باتوں پر ایمان لانا پڑتا ہے جس نے ان کے والد کا ہاتھ دیکھا تھا اور چپ سادھ گیا تھا، بڑے اصرار پر بولا آپ کے کتنے بیٹے ہیں؟

''دو'' والد صاحب نے جواب دیا۔

آج سے ایک ہی سمجھئے!

آزادی کا خواب آنکھوں میں سجا کر نکلے تھے، خواب پورا نہ ہوسکا، ریزہ ریزہ ہوگیا جس کی کرچیاں آج تک دل و دماغ میں پیوست ہیں۔ اکیلے کہاں تک سفر کرتے کہ اکیلا آدمی تو لانگ مارچ بھی نہیں کرسکتا۔

احمد شمیم کی نظموں میں اکثر CIRCE کا ذکر آتا ہے، ماڈرن سوسائٹی کو CIRCE کی طرح بدکار سوسائٹی جو ایک مرتبہ اس چنگل میں پھنس جائے ہرگز نہیں نکل سکتا۔ یہ فاحشہ سوسائٹی انسان کو اپنے خواب اور سفر کی تکمیل سے روکتی ہے۔

احمد شمیم وہ یولیس ہے جس نے نہ تو ٹرائے پر قبضہ کیا اور نہ ہی اپنی ہیلن کو واپس لے جاسکے اور واپس اس خوف سے نہیں جاتے کہ گھر میں اب کون پہچانے گا۔ بقول شمیم ۔

واپسی کے سارے رستے آنکھ میں تحریر ہیں
لیکن اس چھوڑی ہوئی بستی سے خوف آئے مجھے

(انٹرویو، ماھنامه نصرت :1982)

احمد شمیم کا آخری انٹرویو

احمد شمیم کی زندگی کا آخری انٹرویو۔ وفات سے دو دن پہلے......ریڈیو پر ریکارڈ ہوا۔

س:

آخر آپ نے اپنی شاعری کو اساطیری حوالوں سے کیوں شروع کیا؟

ج:

نفسیاتی طور پر اساطیر ہمارے مجموعی اور ٹوٹل لاشعور کا ایک بہت بڑا سمندر ہے اور جب اساطیر کے ذریعے آپ کسی بات کو سامنے لاتے ہیں یا Project کرتے ہیں تو وہ اپنے ماضی کے حوالے سے اور اپنے حال کے ساتھ پیوند لگا کے ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ جس میں دونوں Dimension شامل ہوتے ہیں۔ ایک ماضی کا Dimension اور ایک حال کا Dimension۔ اساطیر کے بغیر جب آپ شاعری کرتے ہیں تو Present کے Existing Moment سے بات شروع کر لیتے ہیں۔ اس میں ماضی کی جہد یعنی Second Dimension نہیں آتی۔ اساطیر کے حوالے سے شاعری کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے (ہر چند کہ یہ بہت مشکل مسئلہ ہے) کہ آپ کے اندر جو Archetyal کریکٹرز ہیں وہ کسی نہ کسی حوالے سے موجودہ زمانے میں کسی نہ کسی فارم میں، کسی نہ کسی صورت، کسی نہ کسی ہیئت میں، کسی نہ کسی جدوجہد یا جذبے تخلیق یا کرب کا ایک رخ بیان کرتے ہیں، تو اس طرح سے آپ کو ایک باقاعدہ کریکٹر ملتا ہے جس کے حوالے سے آپ اپنے جذبات کو Existing Moment کے Context میں Project کرتے ہیں۔

س:

شمیم ہمارے اُردو شعراء جو آپ کے ساتھ رہے یا جن کے ساتھ آپ نے عمر گزاری ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جتنے لوگ اردو میڈیم میں پڑھے ہوئے تھے انہوں نے اس چیز

کو avoid کیا ہے۔ اساطیر کے حوالے سے شاعری نہیں کی۔ سیدھی سی روایتی شاعری جو ہمارے ہاں ہوتی تھی وہ زیادہ تر وہی شاعری کرتے رہے......

ج:

بات یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم تک اردو کا جو میڈیم رہا ہے وہ اپنے روایتی اور کلاسیکل ماحول میں بہت ہی محدود رہا۔ اس پر یہ دروازہ نہیں کھلا۔ مثلاً ہماری اردو پہ پنجاب، بلوچستان اور دوسرے علاقوں کے کلچر کا دروازہ اب آہستہ آہستہ کھل رہا ہے۔ یہاں بھی تو بہت ساری Mythologies ہیں اور پھر بین الاقوامی سطح پر ہمارے یہاں کوئی بڑا دروازہ کوئی بڑی کھڑکی نہیں کھلی۔ ہاں جب میراجی آئے، ن۔م۔راشد آئے، فیض صاحب آئے، دوسرے آئے یہاں کے حوالے سے ساری کھڑکیاں کھلیں جن کا رخ بین الاقوامیت کی طرف ہے۔ ہمارا اپنا کلچر بھی اردو میڈیم کے حوالے سے بہت عرصے تک ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک منجمد رہا۔ اس میں کوئی لچک یا وسعت پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن اب جو صورت حال ہے اور خصوصاً ریڈیو، ٹیلی وژن اور دوسری چیزیں جو ہیں انہوں نے تو ساری صورت حال کو یک جا کر لیا ہے نا اور ہم اس سے Avoid کریں گے یا بین الاقوامی اساطیر اور دوسرے جذبوں کے حوالے سے شاعری نہیں کریں گے تو ظاہر ہے کہ ایک اکائی کے طور پر اپنے حصار میں بند رہیں گے۔

س:

شمیم ہمارے ہاں شعراء شاعری کی ابتداء غزل سے کرتے ہیں اور غزل بھی روایتی قسم کی لکھتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ مقبول ہونے کے لیے غزل ہی زیادہ بڑا ذریعہ رہی ہے اس کے باوجود آپ نے غزل نہیں لکھی اور نظم لکھی اس کی کیا وجہ ہے؟

ج:

بات یہ ہے کہ غزل کے بارے میں میرا ذاتی تاثر ہے کہ اس میں خالصتاً جاگیردارانہ Terminology ہے۔ مثلاً میں نے غالب کی زمین میں غزل لکھی، آپ نے میری زمین میں غزل لکھی یہ زمین کا چکر جو ہے نا۔ یہ جاگیرداری دور کا اثر ہے۔ اس میں ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ جس طرح تصور کائنات جو Copernicus کے ہاں ہے، اس میں انہوں نے کہا کہ جی ایک کرہ ہے اس کے اوپر دوسرا کرہ ہے اس کے اوپر تیسرا کرہ ہے اور زیادہ سے زیادہ کرے ہیں اور اس کے بعد کائنات ختم۔ اسی طرح غزل میں پانچ مصرعے ہیں، چھ مصرعے ہیں، چھ شعر ہیں، سات شعر ہیں، زیادہ سے زیادہ دس شعر کی

غزلیں کہیں گے نا آپ! اس کے بعد پانی ختم ہو جاتا ہے اس میں بھی پابندیاں ہیں۔
ایک گرے کی پابندی یہ ہے کہ اس میں ردیف ہونی چاہیے، پھر گرے کی پابندی یہ ہے کہ
اس میں قافیہ ہونا چاہیے، پھر گرے کی پابندی یہ ہے کہ اس کے مقطع میں تخلص ہونا چاہیے،
اس طرح گرے کی پابندی یہ ہے کہ مطلع اور مقطع دونوں ہونے چاہئیں۔ اس طرح غزل
بھی ہماری محدود جاگیردارانہ سوسائٹی کی طرح محدود کینوس کی شاعری ہے اور محدود کینوس
کی شاعری میں آپ Details بیان نہیں کر سکتے۔

س:

اچھا شمیم آپ کے نزدیک شاعری سے ہم کیا کام لیتے ہیں، آج کی سوسائٹی میں شاعری کا
فنکشن کیا ہے؟

ج:

اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ شاعری کا کوئی کام نہیں۔ شاعری سے آپ کوئی
کام نہیں لے سکتے سوائے اس کے کہ آپ مقصدی شاعری کریں اور اس سے لوگوں کو ان
کے شعور کا، ان کی شخصیت کا، ان کے تشخص کا حوالہ دیں ورنہ شاعری بنیادی طور پر اپنے
اندر کی Tension کو Liberate کرنے کا نام ہے۔ آپ غزل لکھیں یا نظم لکھیں،
مسئلہ Self Liberation ہی کا ہے۔

س:

یعنی آپ نے یہ کوئی ذمہ داری سمجھ کے شاعری نہیں شروع کی......؟

ج:

قطعاً نہیں۔ شاعری ایسے ہے کہ جیسے ایک دکھ کا کھیت ہے جو آپ کو کاٹنا ہے اور اس لیے
نہیں کاٹنا کہ وہ آپ نے بویا ہے، وہ آپ کے اندر بویا گیا ہے اور آپ مجبور ہیں اس
کو کاٹنے کے لیے۔

س:

تو شمیم اس حساب سے دیکھا جائے تو ہم کتنا کاغذ، کتنی Ink اور کتنا کچھ ضائع کرتے ہیں
اس چھوٹے سے out - let کے لیے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا __

ج:

لیکن انسان کا out - let بہت بڑا مسئلہ ہے۔ سارا آرٹ، سارا شور، سارا فلسفہ، سارا
گیت، ساری نظم، ساری موسیقی صرف out- let ہے اور خود آپ نے مذہب میں دیکھا

ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات بنائی کہ اسے اپنے ہونے کا اظہار کرنا تھا۔

"ہاں ہم نے انسان کو پیدا کیا تا کہ ہم پہچانے جائیں"

تو آپ نے نظم لکھی اور آپ کی خواہش ہے کہ اس پہ شارنا سک نہ لکھا ہو، لیکن میں پہچانا جاؤں۔

س:

شمیم اس طرح ہم شاعری کو محدود نہیں کر رہے۔ دنیا کی تحریکوں کو دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس سے بڑے کام بھی لیے گئے ہیں۔

ج:

مثلاً ہم اس وقت افریقہ کی شاعری کو دیکھتے ہیں Black Poetry کو یا پھر فلسطین کی شاعری کو دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے غصے کا out - let ہے نا۔ اس Situation میں پوری قوم ایک Wave Length پر آ جاتی ہے جسے شاعر Tune کرتا ہے۔

س:

اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی یہ بات صرف آپ کی ذاتی بات ہو سکتی ہے۔؟

ج:

وہ تو لازماً میری شاعری میں میری ذاتی بات ہوگی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات آپ کا جذبہ صرف آپ کا جذبہ ہوتا ہے۔ آپ جو شعر کہتے ہیں تو آپ کو Communicate کرتے ہیں۔

س:

لیکن آپ اجتماع کا ایک حصہ ہیں؟

ج:

لیکن ایک ایسی Situation آتی ہے پوری قوم پہ مثلاً علامہ اقبال کی شاعری کو ہم ایک بہت بڑی مقصدی شاعری کیوں کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک پوری قوم برطانیہ سامراج کے خلاف سوچنے، عمل کرنے، لکھنے کی ایک wave length پر جمع ہوگئی تھی۔ اس پوری wave length کو علامہ اقبال نے capture کیا اور جو انہوں نے کہا وہ Already ماحول میں موجود تھی۔ مٹی میں موجود تھا۔

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

مٹی کی Wave-Length اور Tunning کو علامہ اقبال نے صحیح طور پر استعمال کر کے قوم کے مفاد میں ایک بہت عظیم شاعری کی۔ مثلاً میراجی کی شاعری ہے۔ میراجی کی شاعری کا کیا Purpose ہے۔ راشد، اختر شیرانی اور آگے جائیں تو کیٹس ہے یا شکسپیئر کے ڈرامے ہیں۔ ان کا کیا مطلب ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ نے اپنی Projection اس طرح سے کی کہ اس میں دوسروں کی Projection ہو سکے ورنہ تو کوئی مطلب نہیں۔ مثلاً شکسپیئر نے ہیملٹ لکھا۔ اس نے ہمارے اوپر کوئی احسان تو نہیں کیا لیکن ہم بار بار کیوں ہیملٹ پڑھتے ہیں، آپ کیوں پڑھتے ہیں، اس لیے کہ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ ہیملٹ کی ذات کا کچھ حصہ آپ کی ذات کا بھی حصہ ہے۔ اسی لیے میں کہتا تھا کہ اساطیر کے حوالے سے شاعری کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بنیادی Archetypal کردار آپ کی ذات کے کسی نہ کسی حصے میں کسی نہ کسی کونے میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس حوالے سے پڑھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ سی فس وہ ہے جس کو انہوں نے یہ پابندی لگائی کہ پہاڑ پر چڑھو، پہاڑ سے اُترو، پہاڑ پر چڑھو، پہاڑ سے اُترو، پتھر لڑھکاتے رہو، پھر آپ کو یاد آتا ہے کہ یار یہ تو میں بھی روز کرتا ہوں، روز گھر جاتا ہوں، روز گھر سے واپس آتا ہوں۔ Purpose تو کوئی نہیں سوائے یہ کہ کھانا کھا لیا، گھر میں اور ہوٹل میں آیا، یعنی دو انتہاؤں کے درمیان ایک بے مقصدیت کی کیفیت آپ کو اپنے اندر بھی محسوس ہوتی ہے، لہٰذا سی فس کا حوالہ جہاں آئے آپ اپنی ذات کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں یا پرومیتھیس کو لیں۔ پرومیتھیس جو لوگوں کے لیے آگ لے آیا تھا اس نے ترقی کا ایک زینہ طے کر لیا۔ اس کو zeus کے حوالے سے سمندر کی چٹانوں کے ساتھ باندھا گیا جہاں ایک گدھ اس کا دل کھاتا رہتا ہے لیکن وہ surrender نہیں کرتا۔ آپ کے اندر کئی ایسے لمحے آتے ہیں جب آپ Surrender نہیں کرتے، کھڑے ہو جاتے ہیں، افسر کے سامنے کہ جناب یہ جو آپ نے میرا شعر کاٹا ہے یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو سرے سے شعر کا ہی پتہ نہیں تو آپ کیسے کاٹیں گے۔ کچھ نہ کچھ آپ کو پرومیتھیس کی کیفیت محسوس ہوتی ہے کہ ایک چھوٹا سا افسر Zeus کی طرح بیٹھا ہوتا ہے Thunder-Bolt اس کے ہاتھ میں ایک دم گرا یا تار تا سک پر اور جلا کر بھسم

کر دیا۔

س:

شمیم آپ کی باتوں سے میں ایک ذاتی سا سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ ہے کہ شاعری آپ کے نزدیک کوئی شعوری عمل ہے؟

ج:

شاعری شعوری عمل اس حد تک ہے کہ آپ الفاظ استعمال کرتے ہیں ورنہ تمام شاعری ایک لاشعوری کیفیت کا ہیجان ہے اور اظہار ہے۔ شعوری عمل صرف اس وقت ہے جب آپ کو لازماً لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے مگر میں اس سلسلے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے پینٹر ہونا چاہیے تھا۔ پینٹنگ میں آپ قطعاً تمام لاشعوری عمل کو ہی استعمال کرتے ہیں مثلاً لفظ ہیں۔ آپ نے لکھا، زخم ___ زخم کے میرے ذہن میں تو کئی مطلب ہیں لیکن ہو سکتا ہے آپ نے زخم کو کسی اور نقطۂ نظر سے لکھا ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعوری طور پر جب ہم شاعری کرتے ہیں تو اس کی صرف ایک سطح ہوتی ہے کہ لفظ استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ جو ہے یہ کوئی اچھا دوست نہیں۔

س:

مثلاً لفظ نہ بنتے تو ہم کیا کرتے؟

ج:

لفظ نہ بنتے تو ہم گیت گاتے، بغیر لفظوں کے گیت گاتے، ستار بجاتے۔

س:

بغیر لفظوں کے گیت شاعری ہوتی؟

ج:

ستار بجاتے، شاعری نہ کرتے، کوئی ضروری تو نہیں کہ شاعری کرتے۔

س:

میرا مطلب ہے ایک کیفیت ہے آپ کے لاشعور میں، اب وہ کیفیت لفظوں کی شکل میں باہر آتی ہے یا نہیں، اندر شاعری ہو رہی ہے؟

ج:

اندر فن ہو رہا ہے۔

س:

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کے نزدیک شاعر ہونا ایک Attitude ہے، کوئی کام نہیں، ذمہ داری نہیں۔

ج:

یہ اس اعتبار سے آپ درست کہہ سکتے ہیں، شاعر ہونا جو ہے اس کی ذات کے زاویہ کا ایک حوالہ ہے۔

س:

اچھا ایک آدمی جو شاعری نہیں کرتا لیکن شاعرانہ طریقے سے زندہ ہے تو آپ کیا کہیں گے؟

ج:

وہ شاعرانہ زندگی گزارتا ہے، وہ زندگی میں شاعری کرتا ہے، دنیا سے کوئی تعلق نہیں، ٹھیک ٹھاک ہے، مناظر سے خوش ہوتا ہے۔ اس کا Attitude زندگی کے بارے میں Poetic ہوگا۔

س:

شمیم ہماری اردو شاعری میں تصوف کا حوالہ بہت زیادہ ملتا ہے، اسی طرح جدید شاعری میں یہ Existentialism تصوف ہی کے حوالے سے آ گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج:

دراصل Existentialism کوئی فلاسفی نہیں ہے۔ یہ ایک Attitude ہے مثلاً اب اسلام کا مطلب ہے، اللہ پر یقین رکھنا، قیامت پر یقین رکھنا، اللہ کی کتابوں پر یقین رکھنا، فرشتوں پر یقین رکھنا اور نبیوں پر یقین رکھنا۔ آپ اس چینل پر جائیں گے نا۔ اب Existentialism کا عجیب فلسفہ ہے۔ سارتر ہے وہ، دہریہ ہے، کارل جیسپرز ہے یا کرکے گاڈ ہے وہ انتہائی قسم کا صوفی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اور Christianty کے Revival کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ ایک فلسفہ جو دو متضاد کیفیتوں کو اپنے اندر سمو سکتا ہے وہ قطعاً فلسفہ نہیں ہو سکتا۔ فلسفے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اور ہم مسلمان ہیں۔ ہم میں بنیادی چیزیں مشترک تو ہوں نا۔ یہ نہیں کہ آپ مشرق کو جائیں اور میں مغرب کو چلا جاؤں۔

We have to walk in same direction.

اس عمل میں فرق ہو سکتا ہے لیکن راستے میں فرق نہیں ہو سکتا۔

س:

شمیم ہم آپ کی شاعری ضرور سننا چاہیں گے؟

ج:

ایک نظم ہے، جس کا عنوان ہے، "ریت پر سفر کا لمحہ"!

کبھی ہم خوبصورت تھے

کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت

سانس ساکن تھی!

یہ تو وہ نظم ہے جو اپنی خوبصورتی، اپنے بچپن کی خوبصورتی کے بارے میں۔

دوسری نظم۔ اس کے Contrast میں ۔طویل نظم کا ٹکڑا۔ نظم کا عنوان ہے "نہ آنے والے لمحے"

یہی وہ عمر ہے

جب خواب کی ساری کتابیں

بے ورق ہوتی ہیں

ہاتھوں کی لکیروں میں کوئی معنی نہیں رہتے!

یہی وہ عمر ہے جب شاخ پر

کھلتی ہوئی رنگوں کی دستک سے

کوئی کھڑکی نہیں کھلتی!

یہی وہ عمر ہے جب رات

تجہ کی طرح ہونٹوں پہ سرخی مل کے

آنکھوں کے اشاروں سے بلاتی ہے

مگر سانسوں میں، آنکھوں میں، لہو میں

کوئی سرگوشی نہیں ہوتی!

اسی نظم کا آخری بند ہے۔

سفر کی ابتداء میں جھیل کی آدھی مسافت تھی، جھکن تھی

بے کسی تھی،

اور گھرے پانیوں سے کون جیتا ہے ___ منیرہ جانِ من!

جب آسماں سے ریت گرتی ہے تو کوئی آہنی کھڑکی پے
وہ ہونٹوں کے انگارے سجاتا ہے __ لہو میں
کالی آوازوں کی
صدیوں چیخ اٹھتی ہیں __ تو ہم آواز کے رسے کو تھامے
سانس کے ٹوٹے ہوئے پل سے گزرتے ہیں!
__ سلگتے ذائقے کو جسم میں یک طرفہ بہنے دو
خدا رحمان ہے اور بخشنے والا ہے
شاید ہم کو بھیگی رات کے ماتھے پہ لکھے لفظ کو
پڑھنے کی ہمت دے!

س:

شمیم یہ بڑی ذاتی سی نظم لگتی ہے اس کا کوئی خاص پس منظر ہے؟

ج:

اصل میں پس منظر ساری نظموں کا یہ ہے (پتہ نہیں آپ پر بھی وہ لمحہ آتا ہوگا) جب پورے سفر پر آپ پیچھے مڑ کے دیکھتے ہیں کہ کوئی Achevement ہے یا نہیں یا یہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جتنا سفر کیا ہے یہ صحرا میں کیا تھا یا گیلی مٹی پہ۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارا بیشتر سفر ریت پر سفر تھا۔ پاؤں کے نشان ثبت کرنے والے بہت کم ہیں۔ غالب ہیں، میر ہیں اور اقبال ہیں۔ ہمارا آپ کا تو پاؤں کا نشان نہیں بنا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ انکسار ہو، ہوسکتا ہے حقیقت ہو۔ کبھی کبھی آدمی سوچتا ہے کہ کوئی چالیس پچاس سال آخر ہم نے گزارے ہیں دیکھیں کوئی نقش پا ہے لیکن نظر نہیں آتا۔

نثار ناسک:

شمیم آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے ہمیں بہت سا وقت دیا اور اپنے قیمتی خیالات سے نوازا۔

حواشی

نمبر	نام	ماخذ	صفحہ	سال
۱	احمد شمیم	ہوا نامہ بر ہے (خط)	ص:۱۱۳	۱۹۹۵ء
۲	ایضاً	ایضاً	ص:۱۱۷	۱۹۹۵ء
۳	غلام احمد زرگ	خط		
۴	احمد شمیم	ریت پر سفر کا لمحہ	ص:۱۲ـ۹	۱۹۸۸ء
۵	آفتاب اقبال شمیم	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۶۳	۱۹۹۳ء
۶	اعجاز راہی	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۸۱	۱۹۹۳ء
۷	نسیم الحق شمیم	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۱۰۵	۱۹۹۳ء
۸	منیرہ شمیم	ریت پر سفر کا لمحہ	ص:۱۳	۱۹۸۸ء
۹	سردار عبدالقیوم خان (صدر آزاد کشمیر)	ریت پر سفر کا لمحہ	ص:۳	۱۹۸۸ء
۱۰	احمد ندیم قاسمی	ہوا نامہ بر ہے		۱۹۹۵ء
۱۱	جمیل ملک	ہوا نامہ بر ہے	ص:۹	۱۹۹۵ء
۱۲	محمد یوسف	وگ تہ داغ (کشمیری غزل)		۱۹۸۹ء
۱۳	عون محمد رضوی	ڈرامہ		۱۹۷۵ء
۱۴	پروفیسر سید احتشام حسین	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۴۵	۱۹۹۳ء
۱۵	ریاض احمد	ایضاً	ص:۳۲	۱۹۹۳ء
۱۶	پروفیسر کامران	ایضاً	ص:۶۳	۱۹۹۳ء
۱۷	آفتاب اقبال شمیم	ایضاً	ص:۶۸	۱۹۹۳ء
۱۸	فیض احمد فیض	ایضاً	ص:۹۵	۱۹۹۳ء
۱۹	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایضاً	ص:۱۰۵	۱۹۹۳ء

۲۰	سجاد ظہیر	ایضاً	ص:۱۰۸	۱۹۹۳ء
۲۱	احمد ندیم قاسمی	ایضاً	ص:۱۱۰	۱۹۹۳ء
۲۲	کیفی اعظمی	کشمیریات	ص:۱۱۵	۱۹۹۳ء
۲۳	فہمیدہ ریاض	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۱۱۸	۱۹۸۹ء
۲۴	ریاض احمد	ایضاً	ص:۱۱۶	۱۹۸۹ء
۲۵	سرور کامران	ایضاً	ص:۶۶	۱۹۹۳ء
۲۶	احمد شمیم	پس آئینہ	ص:۱۷	۱۹۶۱ء
۲۷	شاہد ثاقب	تعمیر اخبار (مضمون)		۱۹۸۲ء
۲۸	آفتاب اقبال شمیم	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۱۱۸	۱۹۹۳ء
۲۹	سرور کامران	ایضاً	ص:۷۹	۱۹۹۳ء
۳۰	آفتاب اقبال شمیم	ایضاً	ص:۷۱	۱۹۹۳ء
۳۱	خلیل الرحمٰن	ایضاً	ص:۱۱۹	۱۹۹۳ء
۳۲	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایضاً	ص:۶۵	۱۹۹۳ء
۳۳	احمد شمیم	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۶۶	۱۹۹۳ء
۳۴	ن۔م۔راشد	ایضاً	ص:۱۵۳	۱۹۹۳ء
۳۵	نوید شیخ	مقالہ شخصیت وفن: کشمیریات ،احمد شمیم (تحقیق وترجمہ)	ص:۳۳	۱۹۸۹ء
۳۶	جواد زیدی	ایضاً	ص:۷۸	۱۹۸۹ء
۳۷	احمد شمیم	ایضاً	ص:۱۱۶	۱۹۸۹ء
۳۸	جواد زیدی	کشمیری زبان اور شاعری از آزاد (مقالہ احمد شمیم)	ص:۶۳	۱۹۸۹ء
۳۹	جواد زیدی	ایضاً	ص:۳۱	۱۹۸۹ء
۴۰	احمد شمیم	وگ تہ داغ (کشمیری غزل)	ص:۹۱	۱۹۸۹ء
۴۱	پروفیسر حیدر ملک	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم	ص:۷۳	۱۹۹۳ء
۴۲	احمد ندیم قاسمی	ہوا نامہ بر ہے	فلیپ	۱۹۹۳ء
۴۳	احمد شمیم	خط: بنام جمیل		
۴۴	ایضاً	ایضاً		

۴۵	ایضاً	ایضاً		
۴۶	جمیل ملک	ہوا نامہ بر ہے	ص:۸	۱۹۹۵ء
۴۷	احمد شمیم	روزنامہ کشمیر		۱۹۵۶
۴۸	ایضاً	ایضاً		۱۹۵۶ء
۴۹	سعید نقشبندی	روزنامہ کشمیر		
۵۰	نثار ناسک	مقالہ شخصیت اور فن: احمد شمیم		۱۹۹۳ء
۵۱	احمد شمیم	انٹرویو، آزاد کشمیر		
۵۲	نثار ناسک	انٹرویو، ریڈیو		۱۹۸۳ء

کتابیات

اثاثے۔احمد قسیم ص15 ہوا نامہ بر ہے عکسی پبلشرز اسلام آباد 1995

قسیم اکرام الحق، ص21 ہفت روزہ اخبار خواتین۔کراچی، 1981

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو ص31۔44، حلقہ ارباب ذوق۔راولپنڈی 1983

ظفر اقبال نگینہ، ص27، حیدر روزنامہ راولپنڈی 1983

فتح محمد ملک، روزنامہ جنگ۔راولپنڈی 1982

آغا ناصر ...... ایضاً ......

جمیل ملک ...... ایضاً ......

منو بھائی ...... ایضاً ......

ممتاز مفتی ...... ایضاً ......

شفقت تنویر مرزا ...... ایضاً ......

مظہر الاسلام ص31 روزنامہ جنگ۔راولپنڈی، 1982

منصور قیصر ص33 حلقۂ ارباب ذوق۔ راولپنڈی، 1983

کلیم اختر نوائے وقت راولپنڈی، 1983

جی۔ایم۔مفتی، ص41 روزنامہ جنگ راولپنڈی، 1982

آفتاب اقبال قسیم .... ایضاً............

بشیر سراج روزنامہ نوائے وقت۔راولپنڈی 1982

مسعود ساحر۔احمد قسیم میرا دوست، ایس ٹی پرنٹرز۔راولپنڈی، 1983

سرور کامران .... ایضاً............ 1992

جمیل ملک۔اجنبی موسم میں اباتبل ۔ طبع اوّل۔ 1983

آفتاب اقبال قسیم ...... ایضاً...... 1983

ریت پر سفر کا لمحہ۔احمد شمیم، عکسی پبلشرز۔اسلام آباد 1988

نئی نظم اور احمد شمیم، ادبی دنیا لاہور

ہوا نامہ بر ہے۔خطوط احمد شمیم، عکسی پبلشرز، اسلام آباد۔ 1992

احمد شمیم کی غیر مطبوعہ غزل ص118، مقالہ احمد شمیم
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج راولپنڈی۔ 1993

احمد شمیم کا کشمیری کلام دگ ۓ داغ،
کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر۔کشمیر 1989

طاوس باتہالی، فنون۔لاہور 1983

اجنبی موسم میں ابابیل، عکسی پبلشرز۔راولپنڈی

ڈاکٹر ایس۔ایم یوسف، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور، 1989

نثار ناسک۔انٹرویو احمد شمیم۔ریڈیو پاکستان 1982

یونس احمر۔پاکستان ٹائمز

پروفیسر سجاد شیخ، مسلم میگزین۔ راولپنڈی 1984

روزنامے

اخبار(روزنامہ)

پاکستان ٹائمز	راولپنڈی	8/اگست 1982
تعمیر	راولپنڈی	8/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	ایضاً
جنگ	راولپنڈی	15/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	7/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	8/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	17/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	30/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	10/اگست 1982
حیدر	راولپنڈی	8/اگست 1982

ایضاً	ایضاً	9/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	14/اگست 1982
حیدر	راولپنڈی	26/اگست 1982
حیدر	راولپنڈی	22/اگست 1982
مسلم	راولپنڈی	8/اگست 1982
نوائے وقت	ایضاً	8/اگست 1982
ایضاً	ایضاً	2/اکتوبر 1982
ایضاً	ایضاً	10/اکتوبر 1982
وفاق	راولپنڈی	8/اگست 1982

ہفت روزہ رسائل

اخبارِ خواتین (کراچی)	2 سے 12 جون 1981
اخبارِ جہاں	7 جولائی، 1981

ماہنامے

اوراق جدید نظم نمبر، لاہور	1977
فنون، لاہور	1983
مقالہ احمد شمیم۔ راولپنڈی	1993

مقالہ شخصیت و فن۔ احمد شمیم۔ لاہور، پنجاب یونیورسٹی، 1984